زبان وادب کے پرستار۔ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ

ازسید ابوتراب خطائی ضامنؔ

اگر آپ کسی کالج کے پروفیسر کو تحقیقی کام میں مشغول دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو ڈاکٹر محمد صبغتہ اللہ صاحب سے ضرور مل لینا چاہئے۔انھیں زبان وادب سے دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اپنا اسٹڈی روم الگ کر رکھا ہے۔جہاں الماریوں میں بڑی نفاست کے ساتھ اردو عربی فارسی انگریزی اور کنڑا کتابوں کو بڑی نفاست کے ساتھ ترتیب دی ہوئی ہیں دوسری طرف ایک میز ہے جس پر رسالے اور نگارشات کے مسودے پڑے ہوئے ہیں۔اور تیسری طرف computer ہے جہاں آپ کتابوں کا مواد اکٹھا کر کے محفوظ کر لیتے ہیں۔صبح سے شام تک سرکاری ملازمت میں اور ضروریات زندگی فراہم کرنے میں لگ جاتے ہیں۔مگر کھا پی کر جو اسٹڈی روم میں داخل ہو جاتے ہیں تو کیا مجال کہ کوئی آپ کو ان کے کام میں دخل اندازی کرے۔لکھتے رہتے ہیں اور کتابوں سے حوالے نکال کر ان سے نوٹ تیار کرتے ہیں اور پھر کمپیوٹر میں بھر کر مضمون کی شکل بنا دیتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں دو بزرگ اساتذہ کرام مولوی محمد خاں صاحب اور پروفیسر میر محمود حسین صاحب کو تحقیق وتدقیق کا کام کرتے ہوئے دیکھا۔ملازمت سے سبکدوش ہو

نے کے بعد بھی یہ دونوں محترم حضرات تحقیق وتدقیق میں لگے رہتے تھے۔مولوی صاحب زبان اور اردو گرامر ہر حرف آخر تھے کسی لفظ کی اصل اور معانی دریافت کرنا ہوتو آپ سے رجوع ہونا پڑتا تھا اور آپ سوالی کو اس طرح فہمائش کر دیتے کہ وہ بالکل مطمئن ہو جاتا۔ اس کے علاوہ آپ عروض و بلاغت پر ید طولیٰ تھے۔محض چند گھنٹے آپ کے پاس گزارنے سے وہ معلومات حاصل ہو جاتیں جو کئی کتابوں پر بھاری ہوتیں۔

پروفیسر میر محمود حسین صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے تحصیل علم کیا ہے۔ تحقیق وتدقیق میں آپ حرف آخر تھے۔ان کی کتابیں مثلاً ''ریاست میسور میں عربی فارسی اور اردو کتبے'' ایک ایسی کتاب ہے جس پر آپ نے جگہ جگہ گھوم پھر کر وہاں کے کتبے حاصل کئے بعد کتابی شکل میں پیش کر دیا۔جو آج ہر محقق کے لئے مشعل راہ ہیں۔میسور کے نمائندہ شاعر بانکے نواب حسین علی سلطان قریشی العروف بہ نسیم میسوری کا مکمل کلام معہ مقدمہ شائع کیا۔اس کے علاوہ مقالات محمود، ادبیات میسور وغیرہم ایسے ہی تحقیقی مضامین سے بھری ہوئی کتابیں ہیں۔

جناب صبغۃ اللہ صاحب بھی انھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔صرف ڈگری کے طلبگار نہیں تھے بلکہ آج بھی تحقیق وتدقیق کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔آپ دوھرے بدن کے میانہ قد اور وجیہ نوجوان ہیں گفتگو میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔میں نے انہیں جب بھی دیکھا وہ یا تو کالج گئے ہوئے ہوتے ہیں یا اسٹڈی روم منہمک۔بازار میں جاتے ہوں گے مگر کسی دوکان پر نہیں بیٹھتے۔حتی کہ شیواجی نگر میں ضروری کتابیں خریدنے جاتے ہیں تو بھی کتاب خرید کر کھڑے کھڑے واپس آجاتے ہیں۔بڑے

خاموش طبیعت ،ملنسار اور مرنجان مرنج انسان ہیں۔آپ کے صرف دو شوق ہیں چائے اور سگریٹ پتہ نہیں دن رات کتنی پیالیاں چائے اور کتنے سگریٹ پھونک ڈالتے ہوں گے۔شاید یہی وہ دو چیزیں ہیں جو ان کے کام میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔جس کے بل پر وہ مضامین تیار کرتے ہیں۔ بڑے مذہبی اور خوش لباس ہیں۔لباس سادہ مگر قیمتی ہوتا ہے۔ جب کوئی آپ سے ملنے آتا ہے تو بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی اہلیہ المعروف بہ ملکہ جان کو چائے اور بسکٹ کے لئے کہہ کر گفتگو میں لگ جاتے ہیں۔آپ کی اہلیہ بڑی خوش مزاج اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔جو جونیر کالج کی معلّمہ تھیں۔آپ کی خوش دامن صاحبہ رشیدہ بیگم بھی میری ہم وطن ہیں غالباً مجھ سے پانچ چھ سال بڑی ہوں گی انکا اور ہمارا مکان آمنے سامنے تھا آج جس جگہ ٹمکور کا جنرل ہسپتال بنا ہوا ہے وہیں ہمارے گھر تھے ہسپتال کی تعمیر کے لئے ہم تمام اہلیان محلّہ کو نکال دیا گیا اور شہر کے مختلف علاقوں میں ہم لوگ رچ بس گئے۔

آپکا نام ابوالوفا محمد صبغۃ اللہ سعید ہے مگر اسکول میں داخلے کے وقت صرف محمد صبغۃ اللہ درج کرایا گیا جو جاری ہے۔تاریخ پیدائش ۲۷ ستمبر ۱۹۵۰ء ہے۔ پیدائش چترادرگہ میں ہوئی۔آپ کے والد محترم مولوی محمد عبداللہ صاحب جامعی سعیدی رائیدرگی ،موعظف ہائی سکول اردو منشی تھے۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن رائیدرگ میں حاصل کی پھر جامعہ سلطانیہ گلبرگہ ،۱۹۴۳ء میں مولوی کی سند دارالسلام حیدرآباد سے حاصل کی ، پھر دلی گئے ،مگر وہاں حالات سازگار نہیں تھے اس لئے وہاں سے بنارس جا کر مولانا سیف بنارسی کے مدرسہ سعیدیہ سے صحیحین کی سند ۱۹۴۸ء میں حاصل کی۔واپس رائے درگ آکر ادھورا

کورس پورا کیا۔تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنی پھوپھی زاد بہن رحمت النساء سے شادی کی جو خوبصورت اور خوب سیرت خاتون تھیں۔تلاش معاش کے سلسلے میں چترادرگہ آئے جہاں جزوقتی اردو منشی کی حیثیت سے ہائی سکول میں کام کیا، اس دوران P.S.C. سے اردو منشی کیلئے اعلان ہوا آپ نے بھی درخواست بھیجی اور آپ کا تقرر چامراجنگر کی میونسپل ہائی سکول میں تقرر ہوا۔یہیں آپ کے تین بھائی اور تین بہنوں کی ولادت ہوئی ۱۹۸۴ء میں ملازمت سے حسن خدمات پر وظیفہ یاب ہوئے۔۱۹۸۸ء میں فریضۂ حج ادا کیا،۱۱جولائی ۱۹۹۶ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ صاحب نے بی۔اے تک کی تعلیم چامراجنگر کے کالج میں حاصل کی۔ایم اے (اردو) کے لئے مانسا گنگوتری میسور چلے آئے۔یم اے اردو کے ساتھ ساتھ Middle Eastern Studies کا کورس پورا کیا اور ۱۹۷۵ء میں دونوں کورسوں میں First Class کامیاب ہوئے۔دسمبر ۱۹۷۵ء میں First Grade Sira College, میں بحیثیت اردو لکچرار آپ کا تقرر ہوا اور ۱۹۷۸ء میں آپ کی شادی ہوئی۔یہ کالج ایک نجی کالج تھا وہاں کے کارکنوں میں اختلافات ایسے پیدا ہوئے کہ ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم جو بنگلور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو تھیں ان کے پاس ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن ہوا،مگر اس درمیان آپ کا تقرر ترقی اردو بیورو کی سربراہ کی حیثیت سے دہلی میں ہوگیا۔آپ نے انھیں کی سربراہی میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی کام ۱۹۸۹ء پورا کیا۔موضوع تھا ''غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ''۔۱۹۹۱ء میں گورنر کے ہاتھوں

بنگلور یونیورسٹی میں پہلی ڈگری انھیں تفویض کی گئی۔ڈاکٹر صاحب نے تحقیقی میدان میں اپنی پہچان بنالی ہے۔ان کے ان تحقیقی کارناموں کو اردو دنیا فراموش نہیں کرسکتی، کیونکہ یہ تحقیقات آئیندہ تحقیق وتدقیق کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گی۔

تصنیف وتالیف:۔

ان کی پہلی تصنیف **''سرا تاریخ کے آئینہ میں''** ہے۔جس میں انہوں نے نہ صرف شہر سرا کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی ہے بلکہ وہاں کے مکاتب فکر، مقابر اور مدارس کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

ان کی دوسری تنقیدی کتاب جو کہ ڈاکٹریٹ کا موضوع بھی ہے **''غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ''** اس میں آپ نے دکھنی زبان اور ادب پر روشنی ڈالی ہے اور تحقیق وتدقیق کرنے والوں کے لئے راہ ہموار کی ہے۔

''ڈرامے کا فن اور انارکلی'' میں انھوں نے نہ صرف باریک بینی سے ڈرامے کا مطالعہ کیا ہے بلکہ اس کے حسن وقبیح پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مثنوی اضراب سلطانی رفتح نامہ ٹیپو سلطان از حسن علی عزتؔ:۔ٹیپو سلطان کی ایما پر ان کے درباری شاعر ملک الشعراء حسن علی عزتؔ نے سلطان کے جنگی کارناموں کو مثنوی میں پیش کیا زوال سلطنت خداداد کے بعد یہ مثنوی بھی گوشۂ گمنامی میں پڑی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی کو مرتب کرنے کے علاوہ اس پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھ کر شائع کیا ۔جسکی اردو دنیا میں کافی سراہنا کی گئی اور اس کتاب کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

تصوف اور صوفیائے کرام :۔ڈاکٹر صاحب کے اشتراک سے یہ کتاب شائع ہوئی۔**تبصرہ**''اس کتاب کے دونوں مرتبین صد ہزار مبارکبادی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنے سارے ملک و بیرون ملک کے مشاہیر صوفیائے کرام کے حالات و خدمات اور ان کے سلاسل تصوف کی تعلیمات و شجروں کو بڑے سلیقہ سے یکجا ترتیب دیا ہے اور دیگر ادیان و مذاہب اور مکاتب فکر کے تقابلی مطالعہ کے ساتھ تصوف اسلامی اور اس کے تاریخی مواد کو جمع کر دیا ہے۔''اس کتاب کو بھی اردو دنیا نے خاص طور عاشقان اولیاء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اب یہ کتاب نایاب ہے۔

تذکرۂ محققین کرناٹک:۔ یہ وہ تذکرہ ہے جس میں ابتداء سے ۱۹۹۴ء تک کے سندی محققین کے تمام حالات جمع کئے گئے ہیں۔ جو آگے چل کر تاریخ ادب کرناٹک کا ایک اہم باب ثابت ہوں گے۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے۔

تحقیق و تدقیق ،تنقید کے علاوہ ترجمہ پر آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔جس کی کئی ایک مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔سب سے پہلا ترجمہ ڈراما **'ضحاک'** (از ڈاکٹر محمد حسن دہلی) کو کنڑ ازبان میں ترجمہ کیا اور یہ ڈراما رویندر کلاکشیترا بنگلور میں بہت کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کیا گیا۔آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی سوانح حیات کا کنڑا میں ترجمہ کیا ،اس کے علاوہ کنڑا سے اردو زبان میں جناب بشیر کے ڈراما ''**ٹیپو سلطان**'' کو اردو جامہ پہنایا جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی ہی تخلیق ہے ۔**رہنمائے بیجاپور** کنڑا سے اردو میں ترجمہ کیا جو بیجاپور کی تاریخ کے علاوہ وہاں کے آثار قدیمہ کو دیکھنے کے لئے گائیڈ بھی کہی جاسکتی ہے اس میں بیجاپور کے صوفیائے کرام کا بھی تذکرہ ہے۔**کرناٹک کے گیان پیٹھ**

ایوارڈ یافتہ اشخاص کا بھی اردو میں تفصیلی حالات درج کئے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک اور ٹیپو سلطان پر کنڑ کتاب 'شر نگیری شاردا مبے پُنر اتھانا نر پا ٹیپو سلطان' کا اردو ترجمہ ''**بے مثال قابل تقلید بادشاہ ٹیپو سلطان**'' کے نام سے شائع کی ہے جس کی ایک اہم دستاویزی حیثیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب نے ٹیپو سلطان کی سوانح حیات کو بعنوان ''مہد سے لحد تک'' مصور پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان سے مفید کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ انکے علاوہ جو مہتم بالشان کام ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی ادارت میں سہ **لسانی لغت** شائع کی گئی تھی اس میں آپ بھی بحیثیت مدیر شامل رہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان وادب میں مختلف موضوعات پر انہوں نے مضامین وتبصرے موء خر اخبارات و رسائل میں شائع کئے، اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے ہیں اپنی انفرادیت کے لحاظ سے کافی اہم ہیں۔ سیمیناروں میں حصہ لینا اور مقالے پیش کرنا ان کا محبوب مشغلہ کہا جا سکتا ہے۔

غرض یہ کہ آپ کو جہاں مختلف زبانوں پر قدرت حاصل ہے وہ اس کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اپنی مادری زبان اور ریاستی علاقائی زبان کے درمیان مضبوط پل بننے میں کامیاب ہو چکے ہیں دونوں زبانوں میں لین دین ہی اس کی اہم مثال ہے۔ آپ نے زبان وادب کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اس کو اردو اور کنڑ زبان فراموش نہیں کرسکتی۔ اردو خدمات کے اعتراف میں **کرناٹک اردو اکاڈمی** نے انہیں مسلسل دو مرتبہ رکن بنائے رکھا یہ ان کے لئے بہت بڑا **اعزاز** ہے۔ ٹیپو سلطان کے کارناموں کو اجاگر کرنے میں اہم رول ادا کیا جس کے لئے شہر بنگلور کے ایک ادارے 'ٹیپو پرچار سمیتی' نے ''**ٹیپو رتن**'' کے ایوارڈ سے نوازا۔ کل ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے اکھل

بھارت ساہتیہ سمیلن بھوپال نے ''**ساہتیہ شری**'' ایوارڈ دیا۔خدا سے یہی دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو عمر دراز عطا ہو اور ان کے قلم سے ایسے ہی بیش بہا تصنیفات عمل میں آتے رہیں۔آمین۔

سالار میں شائع ہو

ارشادات حضرت علیؓ

- بندے کو چاہئے کہ اپنے رب کے کسی سے امید نہ رکھے اور سواء اپنے گناہوں کے کسی چیز کا خوف نہ کرے۔
- جو کسی بات کو نہ جانتا ہو اس کے سیکھنے میں شرم نہ کرنی چاہئے اور جب کسی سے ایسا مسئلہ پوچھا جائے جس کا اسے علم نہ ہو تو اس کو بے تکلف کہہ دینا چاہئے کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔
- جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔
- ہر انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے ۔
- جس کی زبان شیریں ہوگی اس کے بھائی بہت ہوں گے۔
- اس شخص کو نہ دیکھو جس کا کلام ہے۔ بلکہ کلام کو دیکھو ۔
- احسان زبان کو قطع کر دیتا ہے۔
- جب تم دشمن پر قابو پا لو تو اس قابو پانے کا شکریہ یہ ہے کہ اس کا قصور معاف کر دو۔
- جو شخص کسی بات کو دل میں چھپاتا ہے وہ اس کی زبان کی جنبش سے اور اس کی صورت سے عیاں ہو جایا کرتی ہے۔
- علم ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیتا ہے اور جہل اعلیٰ کو ادنیٰ کر دیتا ہے۔

- علم مال سے بہتر ہے کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور مال کی حفاظت تم کو کرنی پڑتی ہے۔
- ایمان کی علامت یہ ہے کہ جہاں سچ بولنے سے نقصان کا اندیشہ ہو وہاں بھی سچ بولو۔
- احسان کر کے آزاد کو بھی غلام بنایا جا سکتا ہے۔
- جب تقدیر کا معاملہ آجاتا ہے تو تدبیر رائیگاں ہو جاتی ہے۔
- بخیل جلد فقیر ہو جاتا ہے۔ دنیا میں تو فقیروں کی سی زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں اس کو مالداروں کی طرح حساب دینا پڑے گا۔
- احمق ہمیشہ محتاج رہتا ہے۔ اور عقل مند ہمیشہ غنی رہتا ہے اور لالچی ہمیشہ ذلت میں بندھا رہتا ہے۔ طمع کی چکا چوند میں عقل گر جاتی ہے۔
- عالم غیب کے پردے ہٹا دئے جائیں تو یقین میں زیادتی نہ ہوگی۔
- مبارک ہیں وہ لوگ جو گمنام ہوں، وہ لوگوں کو جانتے ہوں مگر لوگ اس کو نہ جانتے ہوں اور اللہ کی رضا مندی اس کو حاصل ہو۔ ایسے ہی لوگ ہدایت کا چراغ ہیں۔ ان کی برکت سے تاریک فتنے دور ہوتے ہیں۔ اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔
- میں قبرستان کے لوگوں کو بہت اچھا ہمنشین پاتا ہوں جو کسی کی بدگوئی نہیں کرتے اور آخرت کی یاد دلاتے ہیں۔
- اپنی زبان اور جسم سے خلا ملا ؤ اور اپنے اعمال و قلوب سے جدائی پیدا کرو۔

- قبول عمل میں اہتمام بلیغ کرو کیونکہ عمل بغیر تقویٰ اور خلوص کے قابل قبول نہیں۔
- عالم وہی ہے جس نے پڑھ کر اس پر عمل کیا اور اپنے علم و عمل میں موافقت پیدا کی۔ اعمال حلقہ و مجالس سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ذات الٰہی سے۔
- حسن اخلاق آدمی کا جوہر، عقل اس کی مددگار اور سب انسانوں کی میراث ہے۔
- وحشت غرور سے بھی بدتر چیز ہے۔
- مانگنے پر کچھ دینا بخشش ہے اور بغیر مانگے دینا سخاوت ہے۔
- عبادت میں سستی معیشت میں تنگی پیدا کرے گی۔
- لذتوں میں کمی آجانا گناہوں کی سزا ہے۔
- سب سے بڑی تونگری عقل ہے۔ اور سب سے زیادہ مفلسی حماقت ہے۔ سخت ترین وحشت غرور ہے اور سب سے بڑا اکرم حسن خلق ہے۔
- احمق کی صحبت سے پرہیز کرو، وہ چاہتا ہے کہ تمہیں نفع پہنچائے لیکن نقصان پہنچاتا ہے۔
- جھوٹے سے پرہیز کرو، وہ قریب کو بعید اور بعید قریب کر دیتا ہے۔ بخیل سے بھی پرہیز کرو وہ تم سے وہ چھڑا دے گا جس کی تم کو سخت ضرورت ہے۔ فاجر سے بھی پرہیز کرو وہ تم کو کوڑیوں کے مول بیچ دے گا۔
- صبر اور ایمان میں وہی نسبت ہے جو سر اور جسم میں۔ جب صبر جاتا رہے تو

ایمان بھی جاتا رہے گا۔ جب سر ہی جاتا رہا تو جسم کیسے بچ سکتا ہے ؟

- انار کو اس کی جھلی کے ساتھ کھانا چاہئے جو دانوں کے درمیان ہوتی ہے، کیونکہ وہ معدہ میں جا کر غذا کو پکا دیتی ہے۔
- ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ مومن ادنیٰ غلام سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا۔

منی افسانے

بخدمت مدیر، ادبی ایڈیشن، روزنامہ 'سالار' بنگلور۔

جناب من! آداب۔ اپنا ایک **منی افسانہ ''انسانیت کے رشتے ناتے''** ارسال کر رہا ہوں امید کہ اپنے اخبار کے ادبی ایڈیشن میں شائع کر کے ممنونیت کا موقع عنایت کریں گے۔

جب سے میں نے سروس جائن کی ہے عام طور پر بسوں کا سفر ہی کرنا پڑا۔ عہد جوانی میں کبھی روزانہ ۲۵۰ کیلو میٹر کا سفر کرنا پڑا، تو کبھی ۱۵۰ کیلومیٹر، اب بھی، جبکہ وظیفہ یابی کے لئے پانچ چھ سال باقی ہیں روزانہ ۱۵۰ کیلومیٹر کا سفر کرنا پڑ رہا ہے۔ گاہے ماہے چند سال اپنی فیملی کے ساتھ ایک جگہ سروس کرنے کا موقع ملا ہو۔ اگر ملا بھی ہے تو بس اس کو ایک خواب ہی سمجھتا ہوں۔ سروس میں تبادلہ عام بات ہے۔ تبادلہ کے وقت حکومت زیادہ تر ایسے لوگوں کو ترجیح دیتی ہے جو عرف عام میں صنف نازک سمجھی جاتی ہے اور اسکی ہر بات کو کسی نہ کسی طرح پر فرنس دے کر راجدھانی میں عام طور پر لانے کی نہیں آنے کی کوشش کو سراہتے ہوئے ان کی پشت پناہی کرتی ہے۔ اور صنف قوی صرف اپنی طاقت کے بل بوتے پر روزانہ کے سفر و حضر کی صعوبتیں برداشت کرتا نظر آتا ہے۔ خیر یہ تو ایک عام بات ہے جو مردوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے لیکن اس کامپٹی شن کے دور میں یہی صنف نازک اس دوڑ میں بھی پیچھے نہیں۔ جہاں میری سروس چل رہی ہے وہاں پر دس فیصد سے زیادہ روزانہ کی سفر کرنے والی خواتین ہیں۔ ہر سال جب بھی تبادلوں کا موسم آتا ہے دوسروں پر سبقت لے جانے کی ناکام کوشش کرتی ہیں اور منہ لٹکائے واپس آتی ہیں۔ دو تین گھنٹوں کا سفر ان کے لئے زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔

ایسے میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ بسوں کا سفر کرتے وقت ہفتہ کے پہلے اور آخری دن بھیڑ کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کا فرق کئے بغیر ہر ایک کو اس بات کی جلدی ہوتی ہے کہ جلد از جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں اور چین کا سانس لیں۔ چند خواتین ایسی بھی ہوتی ہیں جو خاتون ہونے کا فائدہ اٹھا کر اپنی ایک ادائے دلربائی سے ''یکس کیوز می پلیز، ول یو گیو می اے سیٹ، پلیز ایڈجسٹ، اٹ از اے میاٹر آف سم ٹائم!'' کون ایسا شخص ہوگا جو اس لفظ 'ایڈجسٹ' سے متاثر نہ ہوا ہو اور وہ بھی ایک خاتون کی ریکویسٹ کو ٹھکرانے کی نادانی کیسے کر سکتا ہے ؟ چند ساعت وہ بھی اس تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے تاکہ ہمسفر خاتون کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ایک دن کی بات ہے کہ اپنے بس سٹاپ پر اپنی بس کا منظر تھا۔ بند ہونے کے باعث حفظ ماتقدم کے طور پر

عام طور پر چلنے والی بسیں بھی کچھ کم ہی چل رہی تھیں۔اور جو بس بھی آتی اسی کو غنیمت سمجھ کر لوگ دھکا پیل کرتے اس میں گھسے جا رہے تھے اس میں جوان عورتیں بھی تھیں کچھ ان بیاہی لڑکیاں اور کچھ عورتیں چھوٹے بچوں کو کو گود میں لٹکائے اسی بھیڑ بھاڑ والی بس میں گھس کر کھڑے ہونے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں، بڑی بہن کے پاس ہی چھوٹی بہن کھڑی ہوگئی، خاوند بچی کو سنبھالے گود میں لئے کھڑا ہوا تھا بس اپنی رفتار سے ہائی وے پر زناٹے بھرتی چلی جا رہی تھی کچھ مسافر جو بس کے آخری منزل تک جانے والے تھے اپنی سیٹوں پر آرام سے نیند کر رہے تھے۔

گود کی بچی کو اچانک بھوک لگی تو وہ بلبلا اٹھی۔باپ اس کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن بچی ہے کہ آسمان سر پر اٹھائے جا رہی ہے۔رو رو کر جان ہلکان کر رہی ہے آخر ماں سے رہا نہیں گیا لوگوں کی قطار کو چیر کر باپ کے ہاتھوں سے بچی کو لے کر کھڑی رہ جاتی ہے۔لاکھ سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہے گا رہی ہے چوم رہی ہے چمکا رہی ہے۔لیکن بھوک کی ماری بچی کیسے سنبھل پاتی؟

اسی بس میں میرے ساتھ دو اور خواتین ہم سفر سفر کر رہی تھیں دونوں کو میں اچھی طرح جانتا تھا، دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ برسر روزگار ہیں، ایک کا تعلق تملناڈو سے ہے اور دوسری خاتون کا کرناٹک سے۔تمل خاتون کی تقریباً ۲۰۔۲۲ سال کی سروس ہو چکی ہے اور کرناٹک کی اس خاتون کی لگ بھگ ۵۔۶ سال کی سروس، گذشتہ دو سال قبل ایک اعلی تعلیم یافتہ برسر روزگار آدمی سے شادی ہوئی۔ایک سال بعد بچی کی ماں بھی بن گئی۔دونوں خواتین اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔تمل خاتون ایک ضخیم کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی چیں بہ جبیں ہو کر پھر سے مطالعہ میں مصروف ہونے کی ناکام کوشش کی اور کرناٹک کی یہ خاتون جو کسی کے رحم و کرم سے عطا کی ہوئی آدھی سیٹ پر بیٹھے سفر کر رہی تھی بچی کے بلبلانے کو دیکھ کر اپنی سیٹ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور لوگوں کی بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھ کر اس ماں کو اشارے سے بلا کر اپنی جگہ دے کر کہتی ہے کہ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔اس کرم فرمائی کا شکریہ ادا کئے بغیر وہ اس سیٹ پر ایسے بیٹھ گئی گویا یہ اس کا حق تھا (عام طور پر یہ گود کے بچے جس کسی کے گود میں بھی ہوتے ہیں چاہے وہ باپ کے ہاتھوں میں ہو یا ماں کی کمر میں ان کو سیٹ بنا کر دے ہی دیتے ہیں یعنی لوگ ان پر ترس کھا کر اپنی جگہ چھوڑ دیا کرتے ہیں۔چھوٹے بچوں کو لے کر سفر کرنا گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر ریزرویشن کے سیٹ حاصل کرنا ہے چاہے وہ سٹی بس میں ہو یا سول بس میں ہو یا سرکاری بس میں) تھوڑی دیر بعد سنبھل کر بیٹھ جانے کے بعد بچی کو دودھ پلاتی ہے اور بچی آرام سے نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہے ساری بس میں یک گونہ سکون اور سناٹا چھا جاتا ہے اور کرناٹکی خاتون کو روحانی مسرت محسوس ہوتی کہ چلو ماں سے بچی نے سکون پایا اور تمل کی اس خاتون نے بھی کتاب بند کی اور

نیند کا مزہ لینے لگی۔

اس منظر کو دیکھ کر میرا دل یہ کہنے لگا کہ ہیں تو یہ خواتین ایک تمل ناڈو کی ہے جس نے یہ سارا منظر دیکھ کر بھی ذرہ برابر اثر نہیں لیا، ایک کرناٹک کی یہ خاتون ہے جس نے اس تلگو عورت کو جگہ دی اور انسانیت کے تقاضہ کو پورا کیا۔ ہیں تو تینوں عورت ذات ،ایک تو پتھر دل عورت ہے جس کا اس واقعہ کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوا، ایک ہے کہ بے کس، لیکن ایک کرناٹک کی عورت ہے جو رحم و کرم اور قربانی سے اس پر احسان کر رہی ہے۔ آخر منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد اس تلگو عورت نے اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری نہ سمجھا اور بس سے اتر کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آنے لگی۔ اور کرناٹک کی یہ خاتون اپنے پیر دابتے کمر لٹکاتے کسی ایک خالی سیٹ پر دھڑام سے بیٹھ گئی لیکن اگلا ہی سٹاپ اس کی اگلی منزل تھی اور دن بھر اس کو اپنے تدریسی کام میں کھڑے ہو کر ہی مصروف ہونا تھا۔

۱۹_۹_۲۰۰۲

بات پانچ سو کے نوٹ کی

حسب معمول میں اپنی بس سے اتر کر دوسری بس میں سفر کر رہا تھا۔ بس کے آر پورم کے بس سٹاپ پر رکی۔ ایک پختہ عمر کی عورت چادر اوڑھے، بس میں سوار ہوئی اور ایک درمیانی عمر کی برقعہ پوش عورت کے بازو میں سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پیچھے ٹکٹ دینے کے بعد جب کنڈکٹر عورتوں کے درمیان ٹکٹ کا نعرہ لگاتے ہوئے آیا تو جس کو جہاں جانا تھا ہر ایک نے اپنی اپنی ٹکٹ خریدی وہ ابڑھیا کے پاس بھی آیا اور ٹکٹ خریدنے کو کہا۔ بڑھیا نے اپنی منزل بتا کر ٹکٹ کے لئے ۵۰۰ روپئے کا ایک کرارا نوٹ بتایا۔ کنڈکٹر کے ہوش جاتے رہے۔ اس نے کہا کہ دو روپئے کی ٹکٹ کے لئے تم پانچ سو کا نوٹ دے رہی ہو۔ میں اتنی ریزگاری کہاں سے لاؤں دوپہر کی یہ میری فسٹ ٹرپ ہے ابھی میرے پاس اتنا کلکشن نہیں ہے کہ میں تمہیں ریزگاری دے سکوں بہتر ہے تم چھٹا دے دو۔ بڑھیا بڑی چالاک تھی اس نے کہا کہ میرے پاس اگر چھٹا ہوتا تو میں یہ نوٹ تمہیں کیوں دیتی؟ کنڈکٹر نے کہا کہ اچھا ہے تم اگلے اسٹاپ پر اتر جاؤ۔ بس چل پڑی اور آئی ٹی آئی کے سٹاپ پر رکی کنڈکٹر نے کہا چلو تم یہاں اتر جاؤ اگلا اسٹاپ اسٹیج ہے۔ بڑھیا کنڈکٹر سے کہنے لگی کہ ایسے ویرانے میں میں کیسے اتر سکتی ہوں کہیں دوکانوں کے قریب کے اسٹاپ میں اتروں گی

۔کنڈکٹر نے کہا کہ اگر کوئی چیکنگ کے لئے آ گئی تو بڑی مشکل ہوگی تم اتر جاؤ لیکن بڑھیا کی ہٹ دھرمی تھی کہ وہ یہاں نہیں آگے اترے گی اسی بحث میں بس آگے نکل پڑی تو بڑھیا بازو بیٹھے برقعہ پوش عورت سے کہتی ہے کہ پانچ سو روپیہ کا نوٹ لینے سے ڈرتا ہے۔کیا کنڈکٹر کے پاس چلر نہیں ہوتا۔ہوتا ہے مگر وہ نوٹ لینے سے ڈر رہا ہے۔میں بھی اس کو چلر نہیں دوں گی اور آگے بڑھ کر دو کانوں کے قریب ہی اتروں گی۔یہ کہتے ہوئے بڑھیا بس کے سیڑھیوں کے قریب جا کر رکی اتنے میں بس رام مورتی نگر کے دو کانوں کے قریب رکی کنڈکٹر نے پھر سے بڑھیا سے کہا کہ چلو اتر و کیا تمہیں قانون معلوم ہے کہ پچاس اور سو تک کا چلر دیا جا سکتا ہے ۵۰۰ کا نہیں بڑھیا جواب میں کہنے لگی جس کے پاس ۵۰۰ کا ہی نوٹ ہے تو کیا تمہارا قانون ٹکٹ خریدنے سے منع کرتا ہے اگر ایسی ہی بات ہے تو چلو تمہارا قانون ہی سہی میں اتر جاتی ہوں یہ کہہ کر بڑھیا دو کانوں کے قریب اسٹاپ میں اتر گئی تو کنڈکٹر کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تب سامنے بیٹھے ایک شناسا سے بہت آؤ بھگت کی بات کی۔اس شناسا نے کہا کہ ایسے ہی یہ بڑھیا نوٹ بتاتے ہوئے ایک بس سے دوسری بس، پھر دوسری بس پکڑتے پکڑتے اپنی منزل پہنچ جائے گی نہ نوٹ ہی چلے گا اور نہ ہی ٹکٹ ہی خریدی گی ایسے ہی دیکھو کیسے کام چلا گئی۔اور آگے بھی چلائے گی۔کنڈکٹر نے اس سے کہا کہ میرے پاس تو اس سے بھی زیادہ کا چلر ہے مگر میں ہر ایرے غیرے سے پانچ سو کا نوٹ لے کر چلر نہیں لکھ دیتا اگر میری جان پہچان والے، یا اچھی شناخت والے ہوں جبھی جا کر ۵۰۰ کا نوٹ لیتا ہوں ورنہ نقلی نوٹ دینے والے کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔اگلا اسٹاپ قریب تھا میں بھی بس سے اتر پڑا۔

غیر شائع شدہ

ایڈز

روزنامہ سالار کے سنڈے ایڈیشن کافی دلچسپ ہوا کرتے ہیں۔ زیر بحث ۱۵ اور ۲۲ جون کے سنڈے ایڈیشن خاص طور پر قبل ذکر ہیں۔ جس میں میڈیکل زون کے تحت ڈاکٹر خان کا تحریر کردہ موضوع ''ایڈز'' نظر سے گذرا۔ اس بیماری کے بارے میں اتنا تو جانتے ہی تھے کہ یہ لاعلاج مرض ہے۔ W.H.O کی طرف سے سال میں ایک مرتبہ اس بیماری کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے جلسے، جلوس، سیمینار، سیموزیم وغیرہ منعقد ہوتے ہیں۔ میڈیا بھی خاص دلچسپی لیتا ہے تاکہ اس جان لیوا مہلک بیماری سے انسان بچ سکیں۔ لیکن ایک دن کی ساری گڑبڑ کے بعد یہ ساری باتیں بھلا دی جاتی ہیں اور روزانہ کے مشاغل میں یہ بات یاد تک نہیں رہتی کہ کل ہم نے کیا سنا تھا اور اس پر کہاں تک عمل کرنا ہے۔۔۔ ''وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے'' کے مصداق آدمی پھر اپنے اسی رفتار سے آدمی ہی رہتا ہے نہ کہ انسان بننے کی کوشش کرتا ہے ۔ ؎ ''آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا''۔ اور یہ متعدی بیماری ہے کہ لگاتار پھیلتی ہی جارہی ہے اور روز بروز ایسے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے اس میں کتنی دور اندیشی اور حکمت چھپی ہوئی ہے ان آیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے۔

سود کے بارے میں آل عمران: آیت ۱۳۰ میں فرمایا سود میں آدمی محنت کچھ نہیں کرتا صرف حرام کا مال بغیر محنت اور مشقت، خطرہ مول لئے بغیر گھر بیٹھے دُونے پر دُگنا مال بناتے پڑا رہتا ہے۔ یہ طریقہ دوسرے انسانوں کے لئے مالی تنگی کا باعث بنے گا کہ ایک آدمی بغیر کسی قسم کا خطرہ مول لے، دوسرے افراد کے مال میں سے اپنا مال دوگنا کرتا چلا جائے۔

جب مال مفت حاصل ہوتا ہے چاہے وہ سود سے ہو، رشوت سے ہو، غبن سے ہو یا چوری ڈکیتی سے، تو اس سے آدمی اس کو ناجائز طریقے سے بے دریغ خرچ کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا عادی بن جاتا ہے، جس میں اس کو حلال اور حرام کی تمیز نہیں ہوتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لامحالہ ایسی چیزوں پر اپنا حرام سے حاصل کیا ہوا مال لٹاتا ہے کہ دنیا کی لعنت اور ملامت اس کو گھیر لیتی ہے جس میں ایک لاعلاج مرض ایڈز کا بھی ہے۔

جوا:۔ یہ بھی حرام ہے۔ اس میں بھی آدمی مفت میں بغیر محنت کے مال حاصل کرنے کی کوشش میں سارا مال گنوا دیتا ہے۔ جس کسی کو اس کی لت پڑی سمجھئے کہ اس کا گھر برباد ہوا۔ محنت سے حاصل کیا ہوا مال کوئی اور حاصل

کر لیتا ہے۔اور ہارنے والا پوری طرح سے پامال ہو جاتا ہے۔اس کی بھی کئی قسمیں ہیں جیسے تاش، عام طور پر نوکر پیشہ لوگ جب اپنی نوکریوں کو جانے کے لئے دور دراز کا سفر کرتے ہیں تو وقت گذاری کے بہانے جوا کھیلنا شروع کر دیتے ہیں خاص طور پر ریلوں میں، ایک نے پہلے آ کر جگہ بنائی اور پھر ساری ٹیم وقت مقررہ پر جمع ہوئی اور اپنی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے تک کھیل ہے کہ جاری ہی رہتا ہے نہ ہم سفر لوگوں کا خیال ہے نہ بچوں کا نہ بزرگوں کا۔کوئی ایک ہے کہ جیت رہا ہے اور باقی ہیں کہ ہارتے ہی جا رہے ہیں ہارنے والوں کی یہ دھن ہے کہ اگلے کھیل میں ضرور جیتنا ہے اور گیارنٹی کے ساتھ کھیلتا ہے کہ ضرور جیت جائے گا اور لگا تار یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔لاٹری، یہ بھی جوا ہے اور اس کی جس کو لت لگی وہ بھی برباد ہوا۔ریس (گھڑ دوڑ)، اور کئی ایسے کھیل ہیں جس کو جوا بنا کر کھیلا جاتا ہے جیسے کیرم، شطرنج، کرکٹ وغیرہ کھیلوں کے نام پر جوا کھیلنا اور اس کا عادی ہونا بربادی کی علامت ہے۔

شراب:۔قدرتی پھل جہاں تازہ ہوتے ہیں مفید ہیں ان کو کھانے سے انسان کی صحت بنتی ہے اور تندرستی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔لیکن انسان کی عقل کی داد دینی چاہئے کہ اس نے سڑے گلے پھلوں کا بھی استعمال سیکھ لیا مختلف پھلوں کو سڑا گلا کر شراب حاصل کی جاتی ہے۔جس میں کھجور اور انگور کا ذکر تو قرآن مجید میں ملتا ہے لیکن ہندوستان میں کئی اور پھلوں سے بھی اسے تیار کیا جاتا ہے۔یہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کا غلط استعمال ہے۔شراب کے حرام ہونے کا اشارہ پارہ ۱۶ سورہ النحل: آیت ۶۷ میں ملتا ہے۔یہ اُمُّ الخبائث یعنی برائیوں کی ماں یا دوسرے الفاظ میں برائیوں کی جڑ کہلاتی ہے۔اگر دشمن کو برباد کرنا ہو تو کسی مار پیٹ یا جھگڑے فساد کی ضرورت نہیں، اس کو یا اس کی اولاد کو بڑی حکمت کے ساتھ ایک دو مرتبہ شراب یا کسی اور نشیلی چیزوں کو دے دو پھر اپنے آپ وہ اس کا عادی بن جائے گا اور رفتہ رفتہ وہ خود بربادی کے منہ میں چلا جائے گا۔اس کو عار نہیں سمجھے گا۔چاہے خوشی کا موقع ہو یا غم ہر وقت وہ اس کا استعمال کرے گا۔حکومت لوگوں کی نبض کو پہچانتی ہے ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے حکومت کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ حکومت کا سب سے زیادہ ٹیکس اس پر لگتا ہے اور خزانہ کی آمدنی میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ہر کوئی بادشاہ ٹیپو سلطان نہیں ہوتا جو شراب سیندھی اور نشیلی چیزوں پر پابندی عائد کر کے اپنے خزانہ کی آمدنی گھٹا لے۔اور اپنے عوام کی بھلائی کے لئے نقصان برداشت کر لے اور ان کے اخلاقی اقدار میں اضافہ کرے۔

زنا:۔ایک جرم ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک تو ایسا جرم جس سے صرف شخصی حقوق متاثر ہوتے ہیں دوسرے وہ جس کی سزا دینا حکومت اور سماج کے فرائض میں شامل ہو جیسے کہ زنا۔اس جرم پر حکومت اور سماج پر لازم ہے کہ وہ زانی اور زانیہ کو سزا دے، کیونکہ زنا کاری سے بدی کے راستے کھلتے ہیں، شراب جوّے ناچ گانے اور قتل

بھی اس کے ساتھ لگے ہیں۔غنڈہ گردی، آوارگی اور نکماّ پن بے شرمی اور ننگا پن یہ سب زنا کاری کے ساتھ چلتے ہیں ۔زنا کاری کے رواج پڑنے پر کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا بیٹا یا بیٹی اس کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔آدمیت کی روحانی پاکیزگی اور طہارت کے خلاف وحشی درندوں جیسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔اس لئے اسکو بڑی سختی کے ساتھ منع کیا گیا اور اس پر سخت سزا بھی جاری فرمائی گئی۔(۱۷ابنی اسرائیل: آیت ۳۲) پارہ ۲۴۔النور: آیت ۱۔۲۔میں بھی اس کی خرابی اور سزا بیان کی گئی ہے۔

قرآنی احکامات پر عمل کرنے والوں کے لئے برکت ہی برکت ہے۔علماء کی زبانی ان کو بار بار سنا بھی ہے اسی لئے شاید مسلم سماج میں اس کا اثر کم دکھائی دیتا ہے۔لیکن پھر بھی دنیا کے دیگر اقوام میں جو چھوٹ ان حرام اور ناجائز افعال کے لئے ملی ہے اس کے کیا اندیشے اور خطرات ہو سکتے ہیں اس کا جائزہ لینا مشکل ہے۔اور ان سے نہ بچنے کے باعث کیا کیا مشکلات جھیلنے پڑ رہے ہیں اور کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اس کو آئے دن دیکھا جا رہا ہے۔ان مسائل اور مشکلات میں ایک باب ایڈز کا بھی ہے، جس کے بارے میں آگاہی ڈاکٹر خان نے میڈیکل زون میں کروادی ہے۔جب ڈاکٹر خان کا مضمون پڑھا۔تو بے اختیار ڈراما انارکلی کے آخری باب کے پانچویں سین کے پانچویں منظر، سلیم کا یہ جملہ بے اختیار ذہن میں گھومنے لگا ''..... پناہ! پناہ! میرے گرد کس جہنم کا منھ کھل گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے تو نے کس ہیبت کا نقشہ کھینچ دیا'' اسی ایڈیشن میں بڑی ہی مکروہانہ بات جوؤں کا بھیجنا بھی تھا اور یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا حق ہے کہ انہوں نے اس کے بارے میں اس نوجوان کو جواب دیا۔اور مورخہ ۶ جولائی ۲۰۰۳ کے ایڈیشن میں طالبہ کی جو مختصر دردناک کہانی بیان کی گئی ہے اس سے ہم سب کو درس لینا چاہئے کہ ہمارے نوجوانوں کا وحشیانہ رویہ یہی رہا تو آخر کس پر بھروسہ کیا جائے؟ آزادی نسواں کی بے راہ روی آخر کیا رنگ لا سکتی ہے۔ڈاکٹر خان قابل مبارکباد ہیں کہ سماج کے ایسے گھناؤنے مسائل کا حل پیش کر رہے ہیں اور اگر اب بھی ہم نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا تو اس کو ہماری بدقسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

برائے اشاعت

محترمی ایڈیٹر صاحب

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

ڈاکٹر خان کے میڈیکل زون پر اپنے تاثرات روانہ کر رہا ہوں امید کہ آپ اس کو اپنی اولین اشاعت میں شامل

کر کے شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔

واسلام

پروفیسر محمد صبغۃ اللہ

نمبر ۵۰، فورتھ مین، وسنتپا بلاک، گنگا نگر بنگلور ۳۲۔

سالار میں کچھ حصہ شائع ہوا

سید ابوتراب خطائی ضامنؔ۔ شخصیت اور فن

۹۵۔۱۹۹۶ء میں میری ایک کتاب تذکرہ محققین کرناٹک شائع ہوئی۔اس کتاب میں میں نے بڑی کدوکاوش کے بعد ریست کرناٹک کے تقریباً ۳۷ جامعاتی سطح کے محققین کی شخصیت وفن اور تحقیق وتدقیق پر روشنی ڈالی ہے،اسی کو بنیاد بنا کر کئی ایک تحقیقی مقالے بھی تیار ہوئے خاص کر خواتین نے اس سے کافی فائدہ اٹھایا۔اسی کتاب کو دیکھ کر کاملؔ ٹمکوری نے مجھ سے کہا تھا کہ کیوں نہ آپ ٹمکور کے مختلف ادبی شخصیتوں کا ایک مجموعہ تیار کرتے یہاں پر بھی اچھے شعراء وادیب گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں اور ادب کی کئی انجمنیں قائم ہیں اور اپنے اپنے ڈھنگ سے کام کررہی ہیں۔میں نے ان سے کہا تھا کہ ہر ایک کا سوانحی خاکہ اور نمونۂ کلام فراہم کرلو تو انشاءاللہ یہ کام بھی آپ کے اشتراک سے عمل میں آجائے گا اور ٹمکور کے ادباء وشعراء کی ایک مستند کتاب تیار ہو جائے گی۔ میں اپنی مصروفیت میں لگ گیا اور چند دنوں بعد کاملؔ ٹمکوری کا انتقال بھی،بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔چند دن قبل جناب خطائی صاحب سے ملاقات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ صالح منیر صاحب نے اب اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔اس کام میں پہل کرتے ہوئے میرے دیرینہ رفیق جناب ابوتراب خطائی متوطن ٹمکور کے بارے میں کچھ لکھنا مناسب سمجھا۔

موصوف کو میں اپنی سروس کے ابتدائی دور سے جانتا ہوں جبکہ آپ ابھی گورنمنٹ سائنس کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔اور اسی سال آپ بورڈ آف یکزامینیشن کے چیرمن بھی،انہوں نے تجربہ کار اساتذہ کے ساتھ ساتھ نوجوان اساتذہ کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں تجربہ حاصل کرنے کی غرض سے پیپر سیٹنگ دیا کرتے۔۱۹۸۵ء میں جب میں بنگلور شفٹ ہوگیا تو میری اور ان کی دوستی اور مضبوط ہوگئی۔اور آج بھی ہمارے تعلقات ایک فیملی فرینڈز کی حیثیت سے ہیں۔ان سے دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آپ بڑے سنجیدہ مزاج انسان ہیں اور ادب سے لگاؤ ہے۔ان کی تین کتابیں 'دکھنی لغات' 'فن شاعری' اور 'زعفران زار' میری نظر سے گذر چکی تھیں جبکہ میں ابھی طالب علمی کے دور سے گذر رہا تھا۔ان کتابوں میں سے ایک کتاب دکھنی لغات نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔اس پر میرے استاد محترم ڈاکٹر خضر علی خاں مرحوم کا مقدمہ تھا۔انہوں نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی

ہے اور اس کوشش کو سراہا ہے۔ اور یہ کتاب ہے بھی لائق تعریف جس کسی کے ہاتھ میں بھی جائے واقعی داد دینے کے قابل ہے۔ جب ان سے میں خود بہ نفس نفیس ملا تو اس کتاب کے بارے میں اور بھی جانکاری حاصل ہوئی اور اس کے نظر ثانی کا مشورہ بھی ہوا اور یہ کتاب اب کمپیوٹر پر نئے آب وتاب کے ساتھ ۲۰۰۰ء میں، میں نے از سر نو شائع کی ہے۔

موصوف سے ملاقاتوں کے دوران پتہ چلا کہ آپ ایک ادبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد مرحوم **مولوی یو۔ سید میر صاحب** (متوفی ۱۹۷۰) شہر ٹمکور کی ایک اہم اور معروف شخصیت تھی۔ آپ یمپریس گرلس ہائی سکول میں اردو مولوی تھے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ یہ ادبی شخصیت تھی شہر ٹمکور میں ان کی علمی قابلیت کے معترف آج بھی موجود ہیں۔ مولوی خطاؔ صاحب کا وطن مالوف ارڈ گیرہ تحصیل ٹمکور تھا۔ صغر سنی میں آپ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ جبکہ آپ پرائمری میں زیر تعلیم تھے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے بہنوئی جناب محمد امام صاحب نے ان کی دستگیری کی۔ اس قصبے میں پرائمری کی صرف چار جماعتیں تھیں۔ آگے پڑھنے کے لئے گاؤں سے دور باہر جانا پڑتا۔ چنانچہ کورٹگیرہ کی اسکول میں لوئر سکنڈری تک کی تعلیم حاصل کی اور پہلے درجے میں کامیاب ہوئے جس کے نتیجے میں انہیں ماہانہ سات روپیہ پر ۱۹۰۰ء کے ابتدائی سالوں میں ارڈ گیرہ کے پرائمری سکول میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں اردو سکولوں کو **اینگلو ہندوستانی (اردو) سکول اور کنڑ اسکولوں کو اینگلو ورنیکولر سکول** کہا جاتا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد درس وتدریس میں جٹ گئے۔ ساتھ میں ادبی شاعری کا ذوق بھی بڑھتا گیا۔ رفتہ رفتہ ملازمت میں ترقی ہونے لگی اس کے لئے انہوں نے اپر سکنڈری، ہائر سکنڈری ٹریننگ کے امتحانات پاس کئے اور پھر مولوی کلاس میں داخل ہوئے امتیازی درجہ میں کامیابی حاصل کی ان کی ساری ٹریننگوں کا خرچ سرکار نے برداشت کیا۔

مولوی سید میر خطاؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا کلام اس زمانے کا مشہور ومقبول اردو روزنامہ اخبار ''**الکلام**'' میں شائع ہوا کرتا۔ آپ کی ادبی قابلیت کا اعتراف یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کی مرتب کی ہوئی کتاب حکومت میسور نے درس وتدریس کے لئے منظور کی، اور اسے مڈل سکول کے نصاب میں شامل کیا گیا کتاب کا نام تھا ''**گلزار اردو**'' اس کتاب کے منظور ہونے پر حکومت سے انہیں رائلٹی ملی تھی۔ ان سارے باتوں سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مولوی سید میر صاحب تخلص خطاؔ ایک خود ساختہ شخصیت تھی جنہوں نے اپنے ہی قابلیت کے بل بوتے پر کامیابیوں کے منازل طے کئے اور اپنے درس وتدریس کے ذریعہ شہر ٹمکور میں لاتعداد شاگرد بنائے اور ان میں علم وادب کا صحیح

ذوق پیدا کیا۔اور رہتی دنیا تک ان کے دم سے فیضان علم کے چشمے جاری ہوئے۔

سید ابوتراب خطائی ضامنؔ انھیں کے ہونہار فرزند ارجمند ہیں۔آپ کی ولادت مورخہ ۸/اگست ۱۹۲۸ء شہر ٹمکور میں ہوئی۔ابتدائی،ثانوی اور انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم ٹمکور میں حاصل کی۔بچپن سے ہی زبان وادب سے دلچسپی تھی۔ابھی وہ انٹرمیڈیٹ میں زیر تعلیم تھے کہ جشن آزادی سے متعلق ایک مضمون لکھا،جو ۱۹۴۸ء کے روزنامہ الکلام میں شائع ہوا تھا۔اس وقت ٹمکور میں ڈگری کالج کے نہ ہونے کے باعث انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے میسور جانا پڑا،مہاراجہ کالج میسور سے بی اے آنرز کی ڈگری اول درجہ میں حاصل کی۔مسلم ہاسٹل میں قیام رہا۔اس دوران مقامی مشاعروں میں شرکت کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد مہاراجہ کالج میں ہی ان کو ملازمت ملی۔یہاں پر ملازمت کی میعاد ختم ہونے پر انٹرمیڈیٹ کالج چکمگلور میں ملازمت مل گئی۔یہاں تقریباً ۱۴/سال تک ملازمت کرتے رہے۔اردو ادب کی ایک بزم قائم کی اور اسی بزم کے تحت آپ نے 'الحمراء' اور 'فانوس ادب' شائع کئے۔ایک آل کرناٹک مشاعرہ بھی منعقد کیا۔جس کی روداد اور مدعو شعراء کی تصاویر فانوس ادب میں موجود ہیں۔اسی دوران آپ نے ناگپور یونیورسٹی سے یم اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا۔(اسی دوران ۱۶/فروری ۱۹۵۸ء میں آپکی شادی ایک خوبصورت ونیک سیرت،ملنسار صوم وصلواۃ کی پابند خاتون رفیع النساء سے ہوئی۔جو بیگم فرحت خطائی کے نام سے ادبی دنیا میں ایک پہچان بنا چکی ہیں۔آپکے افسانے مضامین وغیرہ روزنامہ سالار کے ادبی ایڈیشن،ایقان گلبرگہ اور سالار ویکلی بنگلور،بانو وغیرہ میں شائع ہوکر کافی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔آپکے افسانے اور مضامین اصلاحی،اخلاقی سماجی اور مذہب سے متعلق ہوا کرتے ہیں۔آپ ایک دختر (جواں سال مرحومہ) اور دو فرزندوں کی ماں ہیں۔)۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ آرٹس وسائنس کالج (گیاس کالج) آئے۔یہاں ان کا قیام چار سال تک رہا۔یہاں کی بزم اردو کے تحت انہوں نے 'حیات نو' کے چار رسالے شائع کئے جن میں ایک طالب علم نمبر بھی تھا۔پھر مہارانی کالج میسور تبادلہ ہوا یہاں بھی چار سال گذارے۔یہاں کی بزم اردو کے تحت آپ نے 'الماس' نامی دو رسالے شائع کئے۔پھر ان کا دوبارہ تبادلہ چکمگلور ہوگیا جہاں انہوں نے یہاں چار سال اور گذارے۔۱۹۷۶ء میں بنگلور کی سائنس کالج کو ان کا تبادلہ ہوا یہیں ان کی ترقی ہوئی۔۱۹۸۴ء میں وہ بحیثیت ریڈر حسن وظیفہ پر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔

ادبی خدمات:۔

۱) ۱۹۶۷ء میں **زعفران زار** شائع کیا۔ یہ لطائف کا مجموعہ ہے۔اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۲) ۱۹۶۸ء میں ایک ناول **'ماسٹر'** لکھا جس میں قدیم ریاست میسور خصوصاً ٹمکور کے ایک دیہات کا پس منظر ہے۔اسی پس منظر میں ایک ماسٹر کی کہانی لکھی گئی ہے

۳) ۱۹۷۰ء میں **دکھنی لغات** کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔اس کی اشاعت میں استادمحترم جناب پروفیسر میر محمود حسین صاحب مرحوم کی حوصلہ افزائی اور امداد شامل رہی

۴) ۱۹۷۲ء میں **'ضرب الامثال اوران کا پس منظر'** شائع کیا۔

۵) ۱۹۸۲ء میں **'فن شاعری' (ایک جائزہ)** شائع کی یہ عروض و بلاغت پر ایک رسالہ ہے۔اس کتاب کو تیار کرنے میں عروض و بلاغت کے اہم کتابوں کا ماخذ حاصل کیا گیا ہے۔یہ کتاب ہر خاص و عام کے لئے یکساں مفید ہے۔خاص کر ادب کے طلباء کے لئے اہم کتاب ہے۔اس رسالہ کا دوسرا ایڈیشن مع ترمیم واضافہ کمپیوٹر پر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

۶) ۱۹۹۲ء میں خطائی صاحب اور میں نے مل کر **'تصوف اور صوفیائے کرام'** مرتب کر کے شائع کی۔اس کتاب کی کافی پذیرائی ہوئی۔یہ کتاب نہ صرف تصوف پر روشنی ڈالتی ہے بلکہ خصوصاً دکھن کے اہم صوفیا کے حالات اور تبلیغ کے بارے میں مفصل معلومات فراہم کرتی ہے۔اتنی بڑی تعداد میں اکٹھا مواد شاید کسی اور کتاب میں فراہم ہو سکے گا۔

۷)ایس یل بھیرپا کا انعام یافتہ کنڑا ناول **'داٹو'** کا اردو ترجمہ کیا۔جس کو ساہتیہ اکادمی دہلی نے ۱۹۹۷ء میں **'پار'** کے نام سے شائع کیا۔اس سے موصوف کی علاقائی زبان کنڑا سے واقفیت ہی نہیں اس پر عبور کا پتہ چلتا ہے۔

۸)اس کے علاوہ بہتیری کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں،مضامین وغیرہ بھی شائع ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ آپ اچھے شاعر بھی ہیں اور بیشتر کلام اخباروں میں شائع ہو چکا ہے نمونتاً یہاں ان کی غزل اور نظم پیش کی جاتی ہے۔

نمونہء کلام

غزل

پڑا ہوا سنگ در پہ تنہا وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا کبھی مچلتا کبھی سنبھلتا وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا

حدیث دلبر نوائے خوشتر جمال رنگیں خیال رنگیں ترے تصور پہ چھانے والے وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا

حریر و دیبا کی سرسراہٹ رخ منور کی تمتماہٹ کلی کا دامن مسلنے والا وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا

شباب و مستی برس رہی تھی مری نگاہیں ترس رہی تھیں لپک کے پیالہ اٹھانے والا وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا

قدم کی آہٹ پہ دل دھڑکتا، جگر کو ضامنؔ کوئی مسلتا کسی کی نیندیں چرانے والے وہ کوئی اور تھا، میں نہیں تھا

ققنس۔ساقی نامہ

(ایک فرضی پرندہ جو عمر طبعی پر پہنچ جانے کے بعد مرجاتا ہے اور اس کی خاک سے دوسرا پرندہ پیدا ہوتا ہے)

اٹھا ساقیا ساغر انگبیں کہ صہبا کی رنگت بڑی دلنشیں

صراحی سے ایسے نتھرتی رہے کہ شمشیر دل میں اترتی رہے

ہوس پھر نہ باقی رہے جام کی خبر نہ رہے اپنے انجام کی

زمانے کے انداز بدلے گئے نئے سازو آہنگ لائے گئے

سر بام کوئی بھی پہنچا نہیں یہ مقتل ہے یارو تماشا نہیں

شفق کی وہ لالی ضیا بخش ہو کہ مانی و بہزاد کا رخش ہو

ستاروں کی بارات سجنے لگی خیالوں کی دنیا مچلنے لگی

جو خیام کی اک رباعی پڑھوں لگے ٹوٹنے رات کا سب فسوں

ستاروں کو بھی نیند آنے لگی جو پروائی پنکھا جھلا نے لگی

اٹھا کچھ خیالات کا یوں ہجوم کہ صحرا میں جیسے ہو باد سموم

شرارے اٹھے جسم زنگار سے لگے پھوٹنے نغمے ہر تار سے

کہانی نہیں ہے یہ فریاد ہے جو بھولے ہیں ان کو بھی کچھ یاد ہے

کوئی اس کو سمجھا ہے اک داستاں مگر یہ حقیقت ہے اک خونچکاں

تمھیں ہی مبصر بناؤں گا میں جو فریاد کی داد پاؤں گا میں

وہ بولی جو دلّی میں بولی گئی رگ و پے میں سب کے سمائی گئی

بہت آن تھی اور بہت شان تھی دھڑکتے ہوئے دل کا ارمان تھی

سخندان پارس کی کچھ نہ چلی یہیں شہر دلی میں گودوں پلی

انھیں عار تھا اس کی تحریر سے مگر باک ہر گز نہ تھا تقریر سے

لبھائے گئی اپنی تقریر سے مگر ہیچ تھی اپنی تقدیر سے

کیا کوچ دلّی سے دور دکن یعنی اک خطہ نار و نور

یہیں اس کی تشکیل ذہنی ہوئی قوی اور توانا تھی پھولی پھلی

کہیں من لگن اور کہیں پھول بن کہیں ماہیار اور چندر بدن

مدھو مالتی کے بھی چرچے ہوئے جو ستونتی مینا کے گائے گئے

بیجاپور میں نصرتیؔ کا کلام قطب شاہیوں میں وجہیؔ کا نام

غرض نام بھی اس کے بدلے گئے کبھی ہندی اور دکھنی بولے گئے

مغل سے ہوا جب سقوط دکن بنا سارا دکن جو دارالحکن

لگے صوفیا اس کو آ تھامنے جو تھی دکھنی نیم جاں سامنے

ولیؔ نے گلے سے لگایا اسے لڑکپن کی حد سے اٹھایا اسے

جلی شمع دلیؔ میں جلنے لگی وہ دکھنی تھی یاں ریختہ بن گئی

کبھی میرؔ و سوداؔ کی تھی حرز جاں جس کا کبھی درد کا امتحان

اٹھا غلغلہ درمیان سخن امام سخن غالبؔ صف شکن

نیا ساز و آہنگ اس نے دیا زباں کو نیا رنگ اس نے دیا

اٹھائی صدا مرد اقبالؔ نے کہ علامہء دہر اقبالؔ نے

زبان جوش و پیغام سے بھر گئی نئی روشنی جگ میں پیدا ہوئی

اچانک مچا ایسا شور نشور جو اپنا تھا ہم سے ہوا دور دور

اسی کی لپیٹ میں زباں آگئی ولی کی زباں بے زباں بن گئی

ابھی وقت ہے مرے دوستو ذرا آگے بڑھ کر اسے تھام لو

جو مرتا ہے زمزم سے نہلاتے ہو دو قطرے خدا را اسے ڈال دو

جو بچنا ہے تو اس کو بچ جانے دو وگرنہ یونہی اسے مرجانے دو
ہمارا تمہارا اجارہ نہیں یہ تقدیر ہے کوئی چارہ نہیں

یہ نظم روزنامہ سالار بنگلور کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئی تھی اور ادبی ایڈیشن کے مدیر جناب حمید الماسؔ مرحوم نے بڑی تعریف کی تھی۔

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ۔ پروفیسر آف اردو۔نمبر ۵۰ آشیانہ۔فورتھ مین گنگا نگر بنگلور۔۵۶۰۰۳۲

روزنامہ سالار میں شائع ہوا

حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا ۲۱۴ رواں صندل وعرس شریف

اس موقع پر مجھ ناچیز کو بھی میسور اور شری رنگا پٹن جانے کا موقع ملا۔ بس دیر سے پہنچی جب میلاد باغ پہنچا تو جناب تلکا ڈ چکر نگے گوڈا صاحب تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی پر مغز تقریر کی اور تاریخ کی روشنی میں حقیقت واضح کی اور یہ جتلانے کی کوشش کی کہ اگر سلطان نہ ہوتے تو آج کے حالات بہت کچھ بدلے ہوتے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں سنگھ پریوار والوں کو بھی خوب آڑے ہاتھوں لیا اور ان کے ناپاک عزائم کو کامیاب نہ ہونے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ بلگام کے ایک چھوٹے سے قریہ سنگولیّی کو جو چتور رانی چینما کے زمانے کا سپاہی تھا اس کے نام سے حکومت کرناٹک نے ایک بہت بڑا پراجکٹ لیا ہے اور سنگولی کو تاریخی مقام اور اس کے ترقی کے لئے ۹ رکروڑ روپئے منظور کئے ہیں۔ ہم اس کی مخالفت نہیں کرتے۔ لیکن جد وجہد آزادی کی اولین شخصیت حضرت ٹیپو سلطانؒ کے نام پر 'کنڑا پرادھیکارا' کے طرز پر ایک 'ٹیپو پرادھیکارا' کا قیام عمل میں لایا جائے اور سلطان ٹیپو شہیدؒ کے نام سے ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ قائم کی جائے جو ایسے بہت سے امور پر روشنی ڈالے گی جس سے سلطان کے اور بھی بہت سے پہلو سامنے آسکیں گے۔ اور آج حکومت اگر ٹیپو سلطان کے انتظامیہ کو اپنائے گی تو یقیناً اس کی موجودہ کوتاہیاں دور ہوسکیں گی۔ سامعین نے اس کی سراہنا کی اور بعد کے مقررین نے بھی ان کے حوالے دے کر اپنی تقریروں کو مختصر کیا۔ سابق وزیر جناب سی یم ابراہیم صاحب تو اپنی شعلہ بیانی کے لئے مشہور ہیں ان کا کہنا تھا کہ اگر ان کی حکومت اگلے چناؤ میں آئے گی تو وہ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے کہ حضرت ٹیپو شہیدؒ کے عرس کے موقع پر سارے کرناٹک میں چھٹی دی جائے تاکہ عقیدتمندان ٹیپو شہید کے عرس میں شریک ہو سکیں۔ وقف بورڈ کی طرف سے سارے ریاست کی مساجد میں حضرت شہیدؒ کے نام سے قرآن خوانی کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ شری رنگ پٹن سے میسور تک راستہ سجایا جائیگا وغیرہ۔ میسور کی معزز ہستی سابق وزیر جناب تنویر سیٹھ اور موجودہ یم ایل نے بھی تلکا ڈ چکر نگے گوڈا اور سی یم ابراہیم صاحب کی تجاویز کی حمایت کی اور وراثت میں پائی ٹیپو کی عقیدت کا بھی ذکر کیا۔ پھر دوسرے مقررین نے بھی حتی المقدور خراج عقیدت پیش کیا۔ ایک انگریز بھی اس مجلس کی زینت بنا تھا اور اس نے بھی اس محفل میں تقریر کی اور ٹیپو سلطان اور ان کے والد نواب حیدر علی خان کی خدمات وغیرہ کی سراہنا کی۔ دادا جان کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔ اور فقراء کی سربراہی میں صندل میلاد باغ سے ہوتا ہوا ٹیپو

سرکل سے مسجد اعلیٰ سرینگا پٹن پہنچا۔ راستہ میں میسور کے دیگر محلوں سے بھی عقیدتمندان ٹیپو صندل لے کر اس جلوس میں شامل ہوتے رہے۔ بعد نماز عصر روایتی شاہی انداز سے صندل نکل کر گنج عام پہنچا۔ بعد نماز مغرب عزت مآب وزیر اوقاف جناب ضمیر احمد خاں، رکن کونسل عبدالعظیم، حج کمیٹی کے چیرمن جناب ذوالفقار علی ٹیپو، وقف بورڈ چیرمن جناب خالد احمد اور سابق وزیر جناب معراج الدین پٹیل صاحب وغیرہ اہم ہستیوں کی حاضری میں وزیر موصوف نے ٹیپو سلطان شہیدؒ کی مزار پر چادر گل چڑھائی۔ شاہی گنبد کے شاہی امام مولانا سید عباس صاحب کی فاتحہ خوانی کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا، مقررین نے اپنی تقاریر میں سلطان شہیدؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ عرس کے موقع پر صرف میسور کے ہی نہیں بلکہ ریاست کے اہم شہروں جیسے بنگلور اور رائچور سے بھی لوگ خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے حاضر تھے۔ جلسہ کے بعد مشاعرہ بھی منعقد تھا۔ ۲۸ر ذی قعدہ حج کے مہینوں میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کی شہادت کے دوصدی بیت جانے پر بھی ان کی ایک دلی آرزو پوری نہیں ہوسکی وہ ہے فریضہ حج کی ادائیگی۔ ''سیرت ٹیپو کے مصنف نے صفحہ ۴۷۱ میں لکھا ہے کہ'' سلطان کی تمنا تھی جس کا وہ اپنے رفقاء سے بار بار ذکر کیا کرتے کہ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ میں روضہ اطہر پر حاضر ہوکر واپسی میں کربلا کی زیارت کرتے ہوئے اپنی دیرینہ آرزو کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ لیکن وقت نے اس کی مہلت نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ۴۹ر سال کی بہت ہی کم عمر عطا فرمائی اور وہ وقت بھی زیادہ تر میدان کارزار میں ہی گذرا۔ حرمین شریفین سے محبت وعقیدت کا عالم یہ تھا کہ جب قسطنطنیہ میں خلیفہ روم کی خدمت میں اپنا پہلا سفارتی مشن بھیجا تو اس کو ہدایت کی کہ واپسی پر مکہ و مدینہ میں حاضری دے کر وہاں اس کی مملکت کی ترقی کے لئے خصوصی دعاؤں کا احترام کرے۔ ہر سال سینکڑوں مسلمانوں کو سرکاری خرچ پر حج کے لئے بھیجا کرتے۔ عمرہ کے لئے بھی عوام کو سال بھر رعایتی سفر خرچ پر بحری جہازوں کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ غرض یہ کہ ایک ملی فریضہ کی ادائیگی اور اس میں مسلسل مصروفیت کی وجہ سے قدرت کی جانب سے انہیں اپنے ایک ذاتی فریضہ کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔''

حضرت ٹیپو سلطان نے بہت سے خواب دیکھے، کچھ خواب کی تعبیریں ان کی شہادت کے بعد پوری ہوئیں، جیسے مملکت کو خوشحال بنانے کا خواب انہوں نے دیکھا، کنم باڈی کے مقام پر بند باندھنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادت کے بعد یہ آرزو پوری کی۔ آج ضلع منڈیا کے کسان ان کے رہین منت ہیں، اس کا پھل حاصل کررہے ہیں۔ مہاراجہ کرشنا راج وڈیر نے اس کی تعمیر پر حکومت سے بند باندھنے کا انتظام کیا اور سر۔ یم۔ وسویشوریا

جیسے ماہر انجینیر کی خدمت حاصل کی اور سر مرزا اسماعیل نے برندا ون کا باغ بنا کر اس کو خوبصورت بنایا۔ یہ ساری ہستیاں اس بند سے جڑیں اور سلطان کے مطابق یہ بند سورج چاند اور ستاروں کے قائم رہنے تک رہے گا تو ان کے بنانے والوں کا نام بھی اس سے جڑا رہے گا۔ ان اصلاحات کے ذریعے ایک حد تک سلطان نے کامیابی حاصل کی۔

وقت کی تنگی اور بے انتہا مصروفیتوں نے انہیں حکومت کے صرف ۱۷ سال عطا کئے۔ اور تاریخ کے لئے یہ مدت انتہائی مختصر ہے۔ انسانی زندگی میں بھی یہ سترھواں سال انتہائی اہم ہوتا ہے اس لئے کہ جوانی کی شروعات یہیں سے ہوتی ہیں۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حکومت نے ابھی نو جوانی کے اس دور میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کو نظر بد لگ گئی اور اسے نوچ کر رکھ دیا گیا۔ انگریزوں نے ملک لوٹا، ان کے ورثاء کو جلا وطن کر دیا۔ لیکن شہیدؒ کے جسد خاکی کو نہیں لوٹ سکے۔ انہیں ان کے منصبی اعزاز کے ساتھ ہماری سرزمین میں سپرد خاک کر دیا جو ہمارے لئے مایہ ناز خزانے سے کم نہیں۔

ہندوستان کو وہ ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے یہ خواب ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء میں پورا ہوا۔ ملک کو آزاد ہوئے آدھی صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ کرناٹک ریاست کو قائم ہوئے ۵۰ سال ہو چکے۔ حکومت کرناٹک اپنی وزارت میں وقف اور حج کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کئے ہوئے ہے اور الحمدللہ اس کا وزیر بھی شروع سے مسلمان ہی رہا ہے۔ کیوں نہ ہم ریاست کرناٹک کی وزارت وقف و حج سے یہ امید کریں کہ ہر سال حضرت سلطان ٹیپو شہیدؒ، اور ان کے والدین کے لئے حج بدل کا انتظام کریں؟۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ صاحب نصاب لوگ اس فریضہ کو نہ صرف ادا کر رہے ہیں بلکہ ان کے والدین کے نام سے جو انتقال کر چکے ہیں حج بدل کرا رہے ہیں اور کمزور طبقہ کے لوگوں کو بھی حج کے لئے اپنے صرف خاص سے بھیج رہے ہیں جو ان کے لئے باعث ثواب جاریہ رہے گا۔ وہ سلطان جس نے ہماری وراثت میں آزاد ملک، خوشحالی، امن و امان کی زندگی چھوڑی، کیا حکومت ان کے لئے اتنا بھی نہ کر سکے گی۔ اگر یہ سلسلہ جاری ہوا تو حضرت سلطان شہیدؒ اور ان کے والدین کے لئے یہ چیز تا قیامت ایصال ثواب ہوگی، اور روز حشر سلطان اور ان والدین کا شمار بھی حاجیوں میں ہو سکے گا۔ اور ان کی ایک دیرینہ آرزو بھی پوری ہو سکے گی جس کی وقت نے انہیں مہلت نہ دی۔

اس موقع پر روزنامہ 'سالار' بنگلور سے شائع ہونے والے موءخر اخبار نے عرس شریف کے موقع پر دو خصوصی مضامین شائع کئے ہیں۔ ایک مضمون 'سلطان شہید وقت کے آئینہ میں' جناب اکرام کاوش صاحب کا ہے جو میسور کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ بہت پسند آیا۔ دوسرا مضمون 'تاریخی ہیرو سلطان شہیدؒ' اشفاق کا ہے، اس

مضمون کا اسلوب کچھ کھٹکتا ہے، کیونکہ جس شخصیت کے بارے میں لکھا جارہا ہے اس کے مرتبہ کا لحاظ رکھا جانا چاہئے ۔قواعد کی رو سے اسم کو زبان میں واحد استعمال کیا جاسکتا ہے۔لیکن جہاں ہم کسی معزز ہستی کے بارے میں لکھ رہے ہیں تو اس بات کا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ اس کی عزت واحترام میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب

روزنامہ بنگلور

سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔آپ سے گذارش ہے کہ اس مضمون کو اپنے اخبار کے اولین شمارہ میں شامل کر کے شکریہ کا موقع عطا کریں۔

والسلام

محمد صبغۃ اللہ۔مقیم بنگلور مورخہ ۲۲ دسمبر ۰۶ء۔

غیر شائع شدہ

نامِ کتاب:۔ تاریخِ میسور(سلطنتِ خداداد)مجلّد
مصنف:۔ڈاکٹرسی وائی یس خان
صفحات:۔ ۴۱۱
سن اِشاعت:۔ ۲۰۱۰ء مطابق ۱۴۳۱ھ
قیمت:۔۲۰۰روپئے
ملنے کا پتہ: براہِ راست مصنف: فون۲۵۷۳۳۸۶۵(۰۸۰)
محبوب بک ڈپو، چاندنی چوک، شیواجی نگر بنگلور، ۵۱
مالی تعاون: قومی کونسل برائے فروغ اردو، آر۔ کے پورم، نئی دلی ۶۶
مبصر:۔ڈاکٹرمحمد صبغۃ اللہ پرنسپال گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج۔ کے۔ جی۔ یف۵۶۳۱۲۲

سلطنتِ خداداد کا ۳۸ سالہ مختصر دور رہا۔تاریخ میسور میں یہ ایک سنہرا باب ہے۔جس کا اعتراف صرف تاریخ دان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم غیر متعصب مصنفوں نے بھی کیا ہے۔بانیٔ سلطنت خداداد نواب حیدر علی خان بہادر کو ابتک صرف ان کے فرزند ارجمند حضرت ٹیپو سلطان شہید رحمتہ اللہ علیہ کے والد کے نام سے متعارف کرایا جاتا۔انگریزوں نے انہیں بدنام کرنے میں کوئی کثر نہ چھوڑی، متعصب غدّار اور نمک حرام تھے وہ جنہوں نے ان بادشاہوں کے احسانوں کو فراموش کر دیا۔شاید انہیں اس بات کا احساس اور ڈر تھا کہ اگر اس خاندان کو پنپنے دیا جائے تو آئیندہ وہ بالکل فراموش کر دئے جائیں گے۔اور ان کی داستان تک داستانوں میں نہیں ہوگی۔لیکن اللہ جس کو رکھے اسے کون چکھے۔حق ہمیشہ حق ہوتا ہے اور باطل باطل ہی۔آج صدیوں کے گذرنے کے باوجود ان میسوری مسلمان بادشاہوں کے نام زندہ و پائندہ ہیں۔

ڈاکٹرسی وائی یس خان نے بڑی کدو کاوش جانفشانی اور لگن محنت وغیرہ سے اپنے پیشہ کے ساتھ مورخ کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل تعریف ہی نہیں بلکہ قابل داد بھی ہے۔تاریخ کا معیار یہ کہ اس میں سائنسی صداقت ہو اور ادبی لطافت سے بھرپور ہو۔اور ان دونوں کا امتزاج مورخ کے لئے لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں۔عام تواریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ تاریخی حقائق، گہرے مسائل کے واقعات وغیرہ کو بڑے تلخ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔تاریخ اور ادب کا آپس میں بڑا گہرا رشتہ ہے، مورخ نے

اگر افسانوی طریقہ سے دلفریب، ودلنشین ودلکش انداز بیان اپنایا تو قاری کے لئے تاریخ بوجھ نہیں بنے گی بلکہ تاریخی حقائق اس کے دل پر ہمیشہ کے لئے کندہ ہوجائیں گی اور یہ کارنامہ مصنف کتب ہذا نے کر دکھایا ہے۔اردو کا قاری آپ کے احسان کو شاید ہی فراموش کر سکے۔۴۱۱صفحات پر مشتمل کتاب کا ایک تہائی حصہّ نایاب اور انمول منہ بولتی تصویروں سے مزین ہے۔انہوں نے آج کی جدید ٹکنالوجی کا بھرپور استفادہ کرتے ہوئے بہ نفسِ نفیس ان تاریخ مقامات پر پہنچ کر خود ان تصاویر کو اکٹھا کیا۔اوران تصاویر کو ہم تک پہنچانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی میوزیم میں ہیں اور حیدر علی کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے ہے۔

نواب حیدر علی خان بہادر کی جدوجہد، ان کی حکمت عملی، چستی، چالاکی دوراندیشی کے باعث میسور کے چند قریوں پر مشتمل حکومت کو ایک وسیع وعریض سلطنت میں تبدیل کیا۔معمولی سپاہی سے سراکے نواب بن گئے۔اس سفر میں انہوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے اس کی مفصل تاریخ کی ابتداء۱۹۳۲ء میں محمود خان بنگلوری سے شروع ہوئی ،اس کا نقطۂ عروج ڈاکٹر خان نے کیا ہے۔اتنا تفصیلی مواد مع تصاویر میں نے شاید کسی اور کتاب میں نہ دیکھی۔انداز بیان اور تصاویر کی دلچسپی نے اس کو شروع سے آخر تک ایک ایک حرف کا مطالعہ کرنے پر مجھے مجبور کیا اور ان چند سطور کے لکھنے پر مجبور کیا۔واقعی دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالی ان کو اس کا اجر عظیم عطا کرے۔

میری رائے یہ ہے کہ اس کتاب کو ہر اردو قاری کے میز زینت بنانا چاہئے۔ہم اردو دان طبقہ کو یہ کتاب ملجائیگی اور مطالعہ سے خوش بھی ہوجائیں گے۔لیکن کیا یہی بات غیر اردو دان طبقہ تک پہنچ سکے گی؟ کیا ہم صدیوں سے زہر آلود فرقہ پرست طبقہ کی غلط فہمیوں کو دور کر سکیں گے؟ کیونکہ آبادی کا ایک بڑا حصہ اردو سے نابلد ہے اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ابتداء ہندی انگریزی اور علاقائی زبانوں میں اسکے تراجم شائع کئے جائیں تو مصنف کی محنت ضائع نہیں جائیگی۔تقسیم انعامات میں طلبہ کو سلطنت خداداد کی دونوں جلدوں کو تقسیم کیا جائے تاکہ نئی نسل کے دلوں میں ان عظیم ہستیوں کے لئے جگہ پیدا کی جاسکے۔

غیر شائع شدہ

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا
تحریری وتقریری اسلوب (مقالہ کا خلاصہ)

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم۔ ربی زدنی علما

محترم المقام جناب صدر، وشہ نشین پر تشریف فرما عہدیداران وارا کین رابطہ عالم اسلامی وسامعین حضرات

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ

آج کے اس سیمنار میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے تحریری وتقریری اسلوب کو پیش کرنے کی کوشش کررہا ہوں یہ ایک بہت ہی وسیع وعریض موضوع ہے لیکن وقت اس کی اجازت نہیں دیتا ۔مقالے کا اختصار پیش ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی متنوع اور گوناگوں شخصیت ایک انجمن کی حامل ہے وہ بیک وقت شہرہ آفاق عالم دین، مایہ ناز مفکر ومبلغ ممتاز مفسر ومحدث، معروف مورخ ومحقق، مشہور سیرت نگار وسوانح نویس، وسیع القلب درویش، مصلح قوم، مقبول پاسبان ملت ومیر کاروان، بلند پایہ مبصر و ناقد اور صاحب طرز انشاء پرداز ادیب کی حیثیت سے جو شہرت ونیک نامی اور سربلندی حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔

مولانا کو اردو اور عربی زبان وادب پر یکساں عبور حاصل تھا۔یہی وجہ تھی کہ آپ کی تحریر اور تقریر میں علمیت اور ادبیت کے ساتھ ساتھ صداقت وطہارت، فضیلت وحکمت، رفعت ووسعت، فصاحت وبلاغت اور دعوت وعزیمت بدرجہ اتم کارفرما نظر آتی ہے۔مولانا نے اپنے علمی، ادبی، تاریخ اور تحقیقی کاموں سے سارے عالم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔مولانا اپنی وسعت نظری، فکر انگیزی فراخدلی، انسان دوستی، بلند طبعی اور عالی حوصلگی سے علم وادب کی تمام تحریکات سے استفادہ کیا، پھر اپنا ایک منفرد اور مخصوص نقطۂ نظر احیائے اسلام ملک وملت کی اصلاح وفلاح سے عبارت تھا۔مولانا اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی تصنیف کا

کام شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر عبدالعلیؒ کی ایما پر ۱۶ سال کی عمر میں ماہنامہ توحید امرتسر میں شائع شدہ ''ہندوستان کا مجاہد اعظم یا مجدد اعظم'' مولوی محی الدین منصوری کے مضمون کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اس مضمون کو علامہ سید رشید رضا نے اپنے رسالہ ''المنار'' میں شائع کیا اور ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ اگر چاہیں تو اسے رسالے کی شکل میں بھی شائع کیا جاسکتا ہے۔ جو بعد میں رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ پہلی تخلیق کے بارے میں کاروان زندگی حصہ اول ص ۱۱۸ میں آپ لکھتے ہیں کہ ''اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر کا کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں۔ تھوڑے عرصہ میں ''ترجمہ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آ گیا اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ میری عمر اس وقت سولہ سال رہی ہوگی۔ یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر سے شائع ہوئی''۔

اس کے بعد مولانا نے علم وادب میں قدم رکھا تو اپنے غیر معمولی تبحر علمی، فکر انگیزی اولوالعزمی اور شرافت نفسی سے مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ آپ کی نثر پختہ اور پر اثر ہے۔ جسے پڑھ کر دل میں نغمگی اور شیرینی کا احساس ہوتا ہے اور نثر میں شاعری کا گمان ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے حسن بیان میں زبردست رعنائی اور دلکشی پیدا ہوگئی۔ اس کی ایک مثال الطریق الی المدینہ'' جس کا اردو ترجمہ'' کاروان مدینہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مقدمہ میں ص ۱۱ پر مفکر شیخ علی طنطاوی نے آپ کی تصنیف کے مقدمہ میں واضح الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں ''ادب سے میرا اعتماد اٹھنے لگا تھا۔ چونکہ ادیبوں میں وہ آسمانی نغمہ عرصہ سے نظر نہیں آتا جس کی لے میں شریف رضی (عہد عباسی کا نامور ہاشمی شاعر) کے وقت سے لے کر عبدالرحیم برعی تک شعراء گاتے رہے۔ جب میں نے آپکی کتاب پڑھی تو یہ کھویا ہوا نغمہ پھر مجھے مل گیا۔ یہ نغمہ آپکی اس نثر میں ملا جو حقیقتاً شاعری ہے لیکن بے ردیف اور قافیہ کی شاعری، برادرم ابوالحسن آپ کا صد ہزار شکریہ کہ آپ نے دوبارہ میرے اندر اپنی ذات اور اپنے ادب پر اعتماد بحال کیا۔'' اسی تصنیف سے ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ فرمائیں

''انسانیت کا جسم تروتازہ تھا مگر دل نڈھال، دماغ تھکا ہوا۔ ضمیر بے حس ومردہ، نبض ڈوب رہی تھی اور آنکھیں پتھرانے والی تھیں، ایمان و یقین کی دولت سے عرصہ ہوا انسانیت محروم ہوچکی تھی .....فلسفی حکیم شاعر اور ادیب کوئی اس میدان کا مرد نہ نکلا۔ سب اس وبا کے شکار تھے۔ مریض

مریض کا علاج کیسے کرے؟ اس دنیا کے مالک کو اپنے گھر کا یہ نقشہ پسند نہ تھا۔ آخر کار اس نے عرب کی آزاد اور سادہ قوم میں جو فطرت سے قریب تھی۔ ایک پیغمبر بھیجا کہ پیغمبر کے سوا اب اس بگڑی دنیا کو کوئی بنا نہیں سکتا تھا۔ اس پیغمبر کا نام نامی محمد بن عبداللہ ہے۔''

حضرت علی میاںؒ نے زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے جنوری ۱۹۵۸ء میں رابطہ عالم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا۔ ایک سال بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں رابطہ کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تو ادب اسلامی کی بنیادیں مضبوط کرنے، ادب اسلامی کے فن تنقید کے ضوابط مرتب کرنے، جدید ادبی فنون یعنی حکایتی اقسام ادب اور ادبی سوانح عمریوں کے بارے میں اسلامی اصول طے کرنے، ادب اسلامی کی تاریخ از سرنو مرتب کرنے، اسلامی ادباء کے مثالی نمونے جمع کرنے، ادب اطفال کی تیاری پر توجہ دینے، ادب اسلامی کی حیثیت کو تسلیم کرنے اور دنیا کے اسلامی ادیبوں کے درمیان خوشگوار رابطہ قائم کرنے، با مقصد ادب کی تخلیق کی راہ ہموار کرنے اور اسلامی ادباء کے مادی ومعنوی حقوق کا تحفظ اور دفاع کرنے نیز ان کے تخلیقی ادب کی اشاعت کا بندوبست کرنے کے ساتھ ہی اس کے اعلیٰ نصب العین یہ طے کیا کہ ادیب خیر کا ذریعہ اور تعمیر کا وسیلہ بنے اور شر کا ذریعہ اور تخریب کا وسیلہ نہ بنے۔ اسلامی شعر وادب کے فروغ کے لئے آپ نے تمام تحریکوں کا مطالعہ کیا اور پھر آپ نے ادب کے بارے میں حتمی نقطۂ نگاہ ان الفاظ میں بیان کیا ''ادب، ادب ہے خواہ وہ کسی بھی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو۔ کسی آسمانی صحیفہ میں ہو۔ اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو۔ سمجھنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح سے کہہ دی سننے والا اس سے لطف اٹھائے اور اسے قبول کرے۔''

حضرت مولانا صرف تحریر کے ہی نہیں تقریر کے میدان کے شہ سوار تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو لگتا تھا کہ جیسے الفاظ کا بحر بیکراں دماغ سے نکل کر زبان پر آنے کے لئے بے قرار ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات ایسے پر اثر انداز سے بیان کرتے کہ وہ عوام کو بھلی لگتی اور دل پر اثر کر جاتی تھی۔ لکھنؤ کے تبلیغی اجتماع کی تقریر کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں سلاست، روانی اور ادبیت کیسے کارفرما نظر آرہی ہے۔

''آج غیر مذہبی انسان، غیر مذہبی انسان سے لڑ رہا ہے، آج غرض سے غرض لڑ رہی ہے۔ آج ہوس سے ہوس ٹکرا رہی ہے، آج شیطان سے شیطان ٹکرا رہا ہے، آج حکومت سے حکومت لڑ رہی ہے، آج پارٹی

سے پارٹی لڑ رہی ہے، ہماری لڑائی اغراض کی ہے۔ کبھی مخلص مخلص سے لڑ نہیں سکتا، کبھی روحانیت روحانیت سے نہیں لڑ سکتی۔ ہمیشہ باطل باطل سے لڑتا ہے۔ ہمیشہ اغراض اغراض سے لڑتے ہیں۔ سارا فساد دنیا میں اغراض کا ہے.....مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔'' (مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں ص ۱۳۸)

اور جب کبھی تقریر میں اصلاحی پہلو آجاتا ہے تو حضرت کا لہجہ قدرے درشت ہو جاتا ہے اور خطاب ناصحانہ شکل اختیار کر جاتا ہے مثال کے طور پر ملت کی بے راہ روی اور شریعت سے سرد مہری جب ان سے برداشت نہیں ہوتی تو وہ برجستہ کہہ اٹھتے ہیں ''ارے صاحب یہ امت مرحومہ، یہ اشرف الامم کس طرح ذلیل اور کیسی خوار ہے۔ ہر جگہ پٹ رہی ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ آپ اپنی زندگی میں کونسی تبدیلی لائے۔ اتنے دنوں سے وعظ ہو رہے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ شادی بیاہ کے رسم ورواج میں کوئی فرق ہے۔ بیس برس پہلے اور دس برس پہلے جو طرز زندگی تھا وہی آج بھی ہے، حقوق العباد میں مال میں، معاملات میں دیانتداری کو ضروری نہیں سمجھتا جو لگ جائے وہ اپنا مال۔ (تعمیر حیات اگست ۱۹۸۲ء ص ۱)

سرزمین عرب پر رہنے والوں اور وہاں سے معاشی فائدہ اٹھانے والوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ۱۳/اپریل ۱۹۹۵ء کو مولانا چاہتے تھے کہ یہ مقالہ جو عربی زبان میں لکھا گیا تھا پڑھیں لیکن دوحہ کے جامع مسجد میں جہاں شرکاء ہزاروں کی تعداد میں حاضر تھے ''اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا حقیقی وزن اور دنیا میں اس کی کارکردگی کا اصلی میدان'' کے عنوان سے تقریر کی، دوحہ یونیورسٹی کے تحقیقی مجلس کی ایک نشست میں مقالہ کا ایک حصہ ''عالم اسلامی کی موجودہ صورت حال اور اس کے مقابلہ واصلاح کا صحیح طریقہ کار'' پڑھا گیا۔ اس مقالہ کا بنیادی مقصد امت اسلامیہ کو اس کا بنیادی عمل اور فریضہ یاد دلانا ہے، وہ یہ کہ میدان بدر میں قلت تعداد، قلت اسلحہ، اور قوتوں اور تعداد میں تفاوت عظیم کے باوجود خلاف قیاس اور خلاف تجربہ، کس شرط اور امتیاز وخصوصیت کی بنا پر اس کو فتح وغلبہ عطا کیا گیا جس کے نتیجہ میں تمام مظاہر عظمت وقوت اور وسعت وطاقت کے ساتھ وجود میں آیا۔

''ولقد نصركم الله ببدر و انتم اذلة، فاتقوالله لعلكم تشكرون'' اس آیت کریمہ میں معرکہء بدر کا ذکر ہے، مختصر سی آیت ہے لیکن اس کے اندر ہمارے لئے بہت سامان عبرت ہے۔ ایک سبق ہے جو فکر کو جلا بخشتا رہے گا عزائم کو سینوں میں بیدار رکھے گا، یہی نہیں بلکہ اس آیت میں ہماری

حیثیت کا تعین بھی ہے، اقوام عالم میں ہمارا کیا کردار ہونا چاہئے اور زندگی کے ہر موڑ پر بدلتے ہوئے حالات میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہئے اس کی طرف واضح رہنمائی ہے۔

آج عالم اسلام میں جو حکومتیں ہیں دولت کی ریل پیل، زندگی کی آسائشیں، علم وفن کا چرچا، کتب خانے، مدرسے یونیورسٹیاں ہیں زندگی کی سرگرمیوں کے تمام میدان موجود ہیں، یہ سب کے سب بلا کسی استثناء کے معرکہء بدر میں فتح ونصرت کا صدقہ ہیں۔ اگر اس جنگ میں کفار کی سازش کامیاب ہو جاتی .....تو آج عالم اسلام کا وجود ہی نہ ہوتا، اور نہ اس کی سرگرمیاں.....جب زندگی ہی سرے سے نہ ہوتی تو پھر زندگی کے کوئی مظاہر بھی نہ ہوتے۔ یہ تاریخ کا ٹھوس، ناقابل انکار اور پائدار حقیقت ہے۔.....

لیکن آپ حضرات میں جن کا مطالعہ وسیع اور گہرا ہے، تاریخ وسیرت نبوی کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ اس معرکہ بدر میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے جب گذرتے ہیں تو ایک اور صرف ایک جملہ ان کی توجہات کا مرکز بن جاتا ہے۔ وہ حیرت وعظمت کے جذبات سے سرشار ہو جاتے ہیں، مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو سرسری طور پر اس جملہ کو پڑھتے ہیں اور سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، حالانکہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اسکو سرسری اور سطحی طور پر کوئی پڑھ کر گذر جائے یہ جملہ حیران اور ششدر کرنے والا جملہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کا معائنہ کیا ..اس حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد آپ نے اللہ تعالیٰ کے آگے سربسجود ہو کر عرض کیا اللھم ان تُھلِك ھذہ العِصابَۃَ لا تُعبَد یعنی اے اللہ اگر تو نے اس مختصر جماعت کو ہلاک کر دیا تو تیری عبادت نہ ہوگی۔ یعنی اے اللہ اگر تو نے اس مختصر جماعت کی شکست کرادی تو دنیا کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔.....لیکن صرف ایک بات نہ ہوگی وہ ہے خالص تیری ذات پاک کی عبادت، تیرے احکام کا دنیا میں نفاذ اور تیرے دین حنیف کی بقاء یہ کام نہ ہوگا اور سب کچھ ہوگا یہی جماعت ہے جو توحید کی داعی اور تیری عبادت گزار ہے جس کا بھروسہ صرف تجھ پر اور جس کا اعتماد تیری ذات پاک پر ہے،..... اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دعا قبول فرمائی تھی اور مسلمانوں کو جنگ بدر میں فتح سے ہم کنار کیا تھا، اللہ نے اپنے رسول کو سچا کر دکھایا۔ اسی بنیاد پر اس وقت کے مسلمان زندگیاں گزار رہے تھے اور ایک مسلم معاشرہ صحیح معنوں میں وجود میں آیا اور ایک اسلامی زندگی عہد نبوی، عہد خلافت راشدہ اور متعدد اور طویل تاریخ زبانوں میں سایہ فگن رہی۔

لیکن افسوس کہ ہم نے ان مقاصد اور روح، جذبات اور ان دینی اور ایمانی محرکات عمل کا حصہ کھو دیا،..... شریعت اسلامی پر مکمل طریقہ سے عمل اور مردہوں یا خواتین ہر طبقہ کی اس پر استقامت، پھر دنیا کو خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دینا اور اس کی کوشش کرنا کہ دنیا میں اللہ ہی کی حکومت اور فرمانبرداری کا رواج ہو۔

ان تقاریر کے علاوہ اور بھی بہت سی تقریریں رسائل کی شکل میں دستیاب ہیں مثلاً اسلام مکمل دین مستقل مذہب، ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل، لسانی وتہذیبی جاہلیت کا المیہ اس سے سبق، محسن عالمؐ، قادیانیت: اسلام، نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت، پیام انسانیت، مقام انسانیت، دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں، نیا طوفان اور اس کا مقابلہ، اسلام اور مغرب، خواص ملت میں ان کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں، عصر جدید کا چیلنج اور اس کا جواب، حالات کا نیا رخ اور علماء دین کی ذمہ داری، نشان راہ، مسلمانان ہند سے صاف صاف باتیں، اسلام ایک تغیر پذیر دنیا میں دنیا میں آنے والے انسان۔ چمن کے پھول یا کانٹے، پندرھویں صدی ہجری ماضی وحال کے آئینہ میں۔ اسلامی بیداری کی لہر پر ایک نظر، ترکی کی مجاہد ملت اسلامی، تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ، امت مسلمہ کی دوہری ذمہ داری، مسلم پرسنل لا کی صحیح نوعیت واہمیت، جب پڑھے لکھے آدمی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑتا ہے وغیرہ ان تقاریر کے عناوین سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے، سماج اور دین پر آپ کی گہری نظر تھی۔

وآخر الدعونا عن الحمد لله رب العالمين

مقالہ نگار
ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
موبائل ۹۴۴۸۳۵۳۸۲۵
مورخہ ۳۰؍نومبر ۲۰۱۳

سوانحی خاکہ

نام:

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

تاریخ پیدائش:

۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۲۷؍ستمبر ۱۹۵۰ء

جائے پیدائش:

چتر درگہ (کرناٹک)

تعلیمی قابلیت:۔

دوران گریجویشن، راشٹر بھاشا وشارد ۱۹۷۱ء (دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس)

یم۔اے (اردو)، میسور یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

یم۔اے (مڈل ایسٹرن سٹڈیس) میسور یونیورسٹی ۱۹۷۵ء

پی ایچ ڈی:۔ ستمبر ۱۹۸۹ء بنگلور یونیورسٹی کی پہلی پی۔ایچ ڈی

مقالہ: غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ زیر نگرانی ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

ملازمت: اور وہ ادارے جہاں میں نے خدمات انجام دیں۔

۹؍دسمبر ۱۹۷۵ء میں فرسٹ گریڈ کالج سرا (ضلع ٹمکور) میں بحیثیت اردو لکچرر میرا تقرر عمل میں آیا۔ یہ ایک نجی کالج تھی اور منتظمہ کمیٹی میں پھوٹ پڑ جانے کے باعث اس کالج کو حکومت کرناٹک نے مورخہ ۱۲۔۱۹۸۴۔اکو اپنی تحویل میں لیا۔ تو یہ گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج بن گیا۔ یو۔جی۔سی کے لحاظ سے ۱۹۸۶۔۱۔اکو سینیر سکیل لیکچر (ریڈر) کی حیثیت سے پلیسمنٹ ہوا۔

تبادلہ: گورنمنٹ آرٹس کالج ٹمکور (۱۹۸۸۔۶۔۶ء تا ۱۹۹۴ء۔۶۔۲۹)، اسی دوران پی۔ایچ ڈی کی بنیاد پر مورخہ ۱۹۸۹۔۹۔۲۲ کو مجھے سیلیکشن گریڈ لکچرر (پروفیسر) کا پلیسمنٹ ملا۔

گورنمنٹ آرٹس کالج بنگلور (۱۹۹۰ء۔۶۔۲۹ تا ۲۰۰۰ء۔۷۔۷)، بحیثیت اردو پروفیسر

خدمات انجام دیں۔ یہاں پر اردو آپشنل کورس کا از سرنو احیاء کیا گیا۔

گورنمنٹ بائس کالج کولار (۲۰۰۰ء۔۷۔۱۸ تا ۲۰۰۷ء۔۷۔۱۷) بحیثیت اردو پروفیسر کی خدمات انجام دیتا رہا۔ اسی دوران ۲۰۰۶۔۱۔۱ سے نئے یو جی سی قوانین عمل میں آئے اور ہمارے نئے پوسٹوں کا اعلان ہوا جس کے تحت مجھے اسوسئیٹ پروفیسر بنایا گیا۔ ریاست کی نئی پالیسی کے تحت ہر تعلق میں ایک نئی گورنمنٹ ڈگری کالج کھولے گئے تو مجھے کے جی ایف میں نئی کالج کھولنے کے لئے ڈپیوٹ کیا گیا۔

۲۰۰۷ء۔۷۔۱۷ کو میں نے یہاں ایک نئی گورنمنٹ ڈگری کالج کی بنیاد رکھی۔ جہاں پر میں نے تاسیسی پرنسپال کی حیثیت اپنے فرائض نبھائے۔ ۲۰۱۰ء۔۷۔۱۷ تا ۳۱ مارچ ۲۰۰۸ء تک کار گذار پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دئے۔ یکم/اپریل ۲۰۰۸ء سے بحیثیت گریڈ I پرنسپل ترقی حاصل کی۔

وظیفہ یابی کے صرف دو مہینے پہلے میرا تبادلہ گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج کے آر پیٹ (ضلع منڈیا) کو ہوا۔ ۲۰۱۰۔۸۔۲ تا ۲۰۱۰۔۹۔۳۰ تک بحیثیت پرنسپال گریڈ۔۱ کے خدمات انجام دیتا رہا مورخہ ۲۰۱۰۔۹۔۳۰ کو سرکاری ملازمت سے وظیفہ حاصل کیا۔

پتہ: نمبر ۵۰۔۱۲' آشیانہ' فورتھ مین، وسنتپا بلاک، گنگا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۲

فون: ۲۳۴۳۳۸۲۵ (۰۸۰) موبائیل: ۹۴۴۸۳۵۳۸۲۵

مطبوعات:۔ تصانیف و تالیفات، ترتیب، تدوین

۱) سرا تاریخ کے آئینے میں

یہ صوبہء سرا کی تاریخ ہے۔ جو بیجاپور کے عادل شاہی، مغلیہ، مراہٹہ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ادوار میں دکن کا پایہ تخت تھا۔ ۱۴ رسال کی محنت شاقہ کے عرصہ میں نادر فوٹو، کچھ فرامین وغیرہ اکٹھا کر کے کافی مواد حاصل کیا۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد اسی کے تتبع میں بہت سی ایسی ہی کتابیں منظر عام پر آئیں جس سے وہاں کی مقامی تاریخیں محفوظ ہوگئیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۶ء کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع

ہوا۔

۲) ڈرامے کا فن اور انارکلی: اس کتاب میں ڈرامے کے فن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ڈراما انارکلی کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈراما میں انارکلی کا کردار مرکزی کردار کافی اہم ہے، اس کردار کی کشش نے ڈراما نگار کو اتنا متاثر کیا کہ اس کو اپنے ڈراما کا نام بھی سوائے 'انارکلی' کے اور کوئی نام سجھائی نہیں دیا۔ انارکلی اکبر اعظم کے دربار کی رقاصہ تھی۔ اس کے حسن و جمال سے شہزادہ سلیم متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس کا عاشق ہو گیا۔ اکبر اعظم شہزادہ کا یہ گناہ عظیم برداشت نہ کر سکا۔ اکلوتا شہزادہ وارث تخت و تاج تھا۔ وہ اس کو سزا تو نہیں دے سکتا تھا، اسی لئے اس نے اس گناہ میں برابر کی شریک انارکلی کو زندہ دیوار میں گاڑ دینے کا حکم دیا۔ غریب رقاصہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا خواب دیکھا۔ امتیاز علی تاج نے ڈراما کے اس پلاٹ کو اتنے خوبصورت اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ اردو ادب میں یہ ڈراما ایک شاہکار ڈراما بن گیا۔ ۱۹۹۰ء میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ڈاکٹر مخر الدین علی میموریل کمیٹی کے جزوی مالی امداد سے اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔

۳) مثنوی اضراب سلطانی / فتح نامہ ٹیپو سلطان

یہ رزمیہ ہجویہ مثنوی ان کے درباری شاعر حسن علی عزت نے سلطان کی ایماء سے ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء قلمبند کیا جس میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ اور ان کے مشترکہ دشمن نظام حیدرآباد اور مرہٹوں سے مقابلہ اور انکی ہزیمت و شکست اور سلطان کی فتح مندی کی تفصیلی داستان ہے۔ اس کا مخطوطہ سالار جنگ میوزیم کی ملکیت ہے۔ جس کو میں نے مرتب کر کے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ یہ مثنوی پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی۔ ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس مثنوی کا ہندی زبان میں ترجمہ ۲۰۰۳ میں ہوا ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی نے ۱۹۹۳ء کا ایوارڈ عطا کیا۔

۴) تصوف اور صوفیائے کرام: ۱۹۹۳ء

اس کتاب میں تصوف اور صوفی ازم کے بارے میں تفصیلی جائزہ کے علاوہ مختلف سلاسل کے اولیاء کے سوانحی خاکے اور ان کے شجرے بھی دئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مختلف صوفیا کے حالات

زندگی ، بنی نوع انسان اور سماج کے لئے ان کے بیش بہا خدمات کے علاوہ بین مذاہب لوگوں میں یکجہتی کا شعور بیدار کرنے میں ان کے کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب جناب سید ابوتراب خطائی ضامن کے اشتراک سے ترتیب دی گئی۔اس کا کنڑا ترجمہ طباعت کے مراحل سے گذرنے والا ہے۔

۵)غواصی کی مثنویوں کا تنقیدی جائزہ: ۱۹۹۷ء

غواصی گولکنڈہ کے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں درباری شاعر تھا۔اس کی تین مثنویاں کا پتہ چلا ہے ا) مینا ستونتی ۲) سیف الملوک و بدیع الجمال (مصر کے شہزادہ اور ایک پری کی داستان عشق)اور طوطی نامہ۔سنسکرت زبان میں طوطے کے زبان سے کہلوائی گئی ۷۲ کہانیوں کا مجموعہ شوکا سبتتی کا ۴۲ کہانیوں کا منطق الطیر کے نام سے فارسی زبان میں ترجمہ ہوا۔غواصی نے طوطی نامہ کے نام سے اس کا دکھنی میں منظوم ترجمہ کیا۔ان تینوں مثنویوں کا ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کی نگرانی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔اس مقالہ پر بنگلور یونیورسٹی نے ۱۹۸۹ء میں پی ۔ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ۔کرناٹک اردو اکادمی بنگلور کی جزوی مالی امداد سے یہ مقالہ ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آیا۔

۶)مینا ستونتی کا تنقیدی جائزہ: یہ غواصی کی مثنوی ہے جس کا ذکر اپنے مقالہ میں کیا گیا ہے اس کو الگ سے کتابی شکل میں ۱۹۹۷ء میں شائع کیا گیا تا کہ طلباء اس سے مستفید ہوسکیں۔

۷) تذکرہ محققین کرناٹک ۔۱۹۹۷ء

اس کتاب میں ریاست میسور کی تین اہم یونیورسٹیاں ،میسور یونیورسٹی، بنگلور،گلبرگہ اور شیموگہ یونیورسٹیوں کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کے شعبۂ اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اور یہاں سے فارغ التحصیل سندی محققین کی مختصر سوانح اور ان کی ادبی کاوشوں کا ۱۹۹۷ء تک جائزہ لیا گیا ہے۔

۸)تحریک آزادئ ہند اور مجاہدین آزادی: ۱۹۹۸ء

آزادی ء ہند کی جشن طلائی کے موقع پر کرناٹک اردو اکادمی نے ایک پروجیکٹ پر کام کیا جس میں مجاہدین آزادی اور جدوجہد آزادی پر تفصیل سے روشنی ڈالنے علاوہ اہم شخصیات کے سوانحی خاکے بھی دئے گئے۔ ان میں چھ آرٹیکل مہاتما گاندھی ، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجیندر پرساد، سرجنی

نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی پر میرے آرٹیکل شامل ہیں۔اس کتاب کو کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔

۹) دکھنی لغات: سید ابوتراب خطائی صاحب ضامن کی مرتب شدہ اس لغت کا پہلا ایڈیشن اردو لائبریری سنٹر والوں نے بہت پہلے شائع کیا تھا۔ مرتب اور میں نے اس کا از سرنو جائزہ لیکر ۲۰۰۰ء میں اس کا جدید ایڈیشن کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ آفسٹ پر شائع کیا۔

۱۰) فن شاعری: سید ابوتراب خطائی صاحب ضامن کی مرتب شدہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اردو لائبریری سنٹر والوں نے بہت پہلے شائع کیا تھا۔مرتب اور میں نے اس کا از سرنو جائزہ لیکر ۲۰۰۰ء میں اس کا جدید ایڈیشن کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ آفسٹ پر شائع کیا۔

۱۱) ماسٹر: یہ ناول سید ابوتراب خطائی صاحب ضامن نے پہلے اردو میں لکھا۔ پھر انہوں نے اس کا کنڑا میں ترجمہ بھی کیا۔جس پر مقدمہ مجھ سے لکھوایا

۱۲) اسماء الحسنٰی مع حمد ونعت: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم کے اشتراک سے یہ کتاب ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۔۲۶) جامعہ بنگلور کے بورڈ آف سٹڈیس (یو۔جی) کی مجلس ادارت میں ۲۰۰۵ء تا ۲۰۰۹ء تک ایک رکن کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دئے۔اس عرصہ میں مجلس نصاب کے تحت جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں میرا کافی اشتراک رہا۔سفینۂ ادب۔بی کام کے نصاب میں ڈراما ٹیپو سلطان کا ایک منظر شامل کیا گیا۔اثاث ادب برائے دوسرا سمسٹر (کامن سلبس) ٹیپو سلطان کے ایجادات واختراعات کے عنوان سے مضمون شامل کیا گیا تھا۔کاروان ادب برائے بی سی اے پہلا اور دوسرا سمسٹر میں مرزا غالب کے سوانحی حالات پر مبنی ایک مضمون شامل کیا گیا۔اس عرصہ میں ۱۴ کتابیں مرتب ہوکر جامعہ بنگلور کے پرسارنگا سے شائع ہوئیں۔

۲۷) بیگم فرحت خطائی کے افسانوی مجموعہ آئینہ کا مقدمہ تحریر کیا۔یہ کتاب کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نے ۲۰۰۹ء میں شائع کی۔

تراجم

۲۸)ضحاک:۱۹۸۶ء

یہ ایک اردو کا اسٹیج ڑامہ ہے جس کے مصنف ڈاکٹر محمد حسن نئی دلی تھے ایرجنسی میں درپیش حالات کو استعارہ اور کنایہ میں بیان کرتے ہوئے انہوں نے یہ ڈرامہ تحریر کیا تھا۔جس کا میں نے کنڑا میں ترجمہ کیا اور شائع کیا۔ یہ ڈراما کنڑا ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا۔میرے مرحوم دوست مانو جو کنڑا کے لکچرر تھے ساتھ ہی فلموں اور ڈراموں میں ایکٹ کیا کرتے تھے انہوں نے اس ڈرامہ کو رویندرا کلاکشیترا بنگلور میں کئی بار اسٹیج کیا اور بہت داد پائی۔

۲۹)ماحولیاتی آلودگی: ایچنو رشانتا لائبریرین نے یہ رسالہ لکھا تھا جس کا میں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔(۱۹۹۶ء)

۳۰) آل انڈیا ملی کونسل بنگلور شاخ نے ۱۹۹۶ء میں کاروان یکجہتی کا انعقاد کیا تھا جس میں مجھے بھی شامل ہونے کا موقع حاصل ہوا تھا۔اس کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی تھی جس کا کنڑا میں ترجمہ کر کے سارے ریاست میں تقسیم کیا گیا۔

۳۱۔۳۲) کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور نے ۱۹۹۷ء میں کنڑا۔اردو اور اردو۔کنڑا ڈکشنری کا نیا ایڈیشن شائع کیا جس کے تیار کرنے میں مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔جس کا ذکر ڈکشنری میں ملے گا۔اس کی خوب پذیرائی اور نکاسی ہوئی۔

۳۳)

مضامین و مقالے:۱۹۷۴ء سے، آج تک تقریباً ۵۰ سے زیادہ مضامین و مقالے ملک کے موقر اخبارات و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔اے آئی آر بنگلور سے متعدد مضامین و مقالے نشر ہو چکے ہیں۔

ان کے علاوہ ریاست و بیرون ریاست،کل ہند سطح و بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے متعدد سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس، کارگاہ و مشاعروں میں شرکت رہی اور مقالے بھی پڑھے۔کارگاہ وادبی مقابلوں کا انعقاد بھی کیا ہے۔

مختلف ادبی و تعلیمی اداروں سے وابستگی، جن کی تعداد تقریباً ۱۵ ہے۔

اعزازات :۔**مثنوی فتح نامہ ٹیپو سلطان/اضراب سلطانی** کی اشاعت پر ۱۹۹۳ء میں **اردو اکادمی ایوارڈ**، بنگلور یونیورسٹی ٹیچرس اسوسیشن نے مندرجہ بالا تحقیقی مقالہ پر پی ایچ ڈی تفویض ہونے پر ۱۲۱/دسمبر ۱۹۹۶ء توصیف نامہ کے ساتھ اعزاز پیش کیا، **ڈرامہ ٹیپو سلطان** کی اشاعت پر کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نے سلور جبلی مومنٹو پیش کیا، **شرنگیری شاردامبے پنر پرتھشٹہ نر پہ ٹیپو سلطان** کے اردو ترجمہ پر **ٹیپو رتن ایوارڈ** ۲۹/دسمبر ۲۰۰۱ء میں عطا ہوا، ۱۴/جون تا ۱۶/جون دسمبر ۲۰۰۴ء میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ سمیلن نے اپنی جملہ ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے **ساہتیہ شری ایوارڈ** عطا کیا۔

خصوصی مطالعہ:۔ دکنی ادب، کمپیوٹر سائنس، خلائی سائنس، حیدر علی و ٹیپو سلطان، ملکی و ملی حالات کا خصوصی مطالعہ، قرآن وحدیث کی روشنی میں جدید سائنس کا مطالعہ، نایاب مخطوطات و کتب کا مطالعہ

پتہ:۔
نمبر ۵۰۔۱۲/آشیانہ فورتھ مین
وسنتپا بلاک، گنگا نگر، بنگلور
۵۶۰۰۳۲

Bio data Urdu

محترمی جامی صاحب
ایڈیٹر ادبی ایڈیشن
روزنامہ سیاست بنگلور

اظہار خیال

سلام مسنون

مورخہ ۱۱ر جولائی کا ادبی ایڈیشن بصر نواز ہوا۔ جامی صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی ادارت میں ادبی ایڈیشن روز بروز ترقی کر رہا ہے اور نکھر رہا ہے۔ اللہ کرے اور بھی اس میں نکھار پیدا ہو۔ نقش اول میں بڑا دلچسپ افسانہ 'رنگے ہاتھوں گرفتار ہونا' پڑھنے کو ملا۔ منہ سے بے ساختہ نکلا واہ ایک محاورہ بھی ایک افسانہ بنتا ہے۔ عام طور پر یہ محاورہ اردو میں چور کی چوری پکڑے جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ واقعی جیلانی جمیل نے کمال کر دکھایا ہے۔ ویسے الفاظ اور محاورے اپنے اندر ایک اتاہ سمندر لئے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی دلچسپ تاریخ ہے۔ ادبی کوئز کا سلسلہ شروع کیا ہے واقعی ان میں پوچھے جانے سوالوں سے اردو دان حضرات کو پھر سے اپنی پڑھائی کا اعادہ ضروری ہو گیا ہے۔ دیکھیں کہ ہمارے قاری اور طلباء و طالبات ان کو حل کرنے میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں۔ ساحر ٹمکوری کا افسانہ 'پونم کی رات' پہلے دو قسطوں میں پڑھ چکا تھا اب 'پھول کی زبان کی' پہلی قسط دیکھی شاید اختتام اچھا ہی ہوگا۔ 'لڑک کو آئی سو ڈلّی حلال' یہ دکنی محاورہ تو سنا تھا۔ مگر انشائیہ نگار نے کمال کر دیا۔ چکن گنیا میں ضیا جعفر نے آج کے سماج کی عکاسی بہتر طور پر کی ہے۔ انشائیہ دلچسپ رہا۔ نثار احمد بغدادی کا منی افسانہ 'ذاتی معاملہ' بھی بہت اچھا رہا۔ ظاہرا ہم کتنے ہی کسی کے ہمدرد ہوں لیکن ذاتی معاملات میں دخل اندازی پسند نہیں کی جاسکتی۔ 'شب معراج' پر دونوں نظمیں پسند آئی۔ مطبوعات کے تبصرے پسند آئے۔ اظہار خیال کالم بھی خاصا رہا۔ ڈاکٹر خان کا مستقل کالم تاریخ واقعات بہت مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ تاریخ فرشتہ جو کئی جلدوں پر منحصر ہے ایک مقتدر تاریخ ہے۔

ویسے بعد میں بھی بہت سی تاریخیں آئیں لیکن فرشتہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ڈاکٹر خان نے اپنے خط میں مجھ سے اصرار کیا ہے کہ میں بھی اس کالم میں حصہ لوں۔ چلئے آپ کے اصرار پر ہم بھی اظہار خیال کریں گے۔ اس ہفتہ غیاث الدین بلبن کے بارے میں ہے۔ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ گذشتہ ہفتہ ایک محاورہ پر آپ نے لکھا تھا کھال کھینچ لینا۔ ویسے تو اس محاورہ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ بڑا ظالم محاورہ ہے۔ جانوروں کا شکار کرنے کے بعد ان کی کھال کھینچ کر ان میں بھس بھر کر اس کے اصل کو لانا دیکھا ہے۔ ذو کے نمائش گھر میں، ہمیں میسور مہاراجہ کے محلات اور اس زمانہ کے بہت سے روساء حضرات کے گھروں میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن اب فاریسٹ ایکٹ سخت کر دیا گیا ہے اور جنگلی جانوروں کا شکار منع کر دیا گیا ہے۔ اب ایسی چیزیں صرف آنٹک کے طور پر دیکھنے کو ملیں گی۔ انسان کے جسم پر اگر تھوڑی سی کھروچ بھی آجائے تو وہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔ فوراً ATS انجکشن، دوائی یا لیپ کر کے درست کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ جب تک وہ زخم بھر نہیں جاتا چین نہیں آتا۔ ایسے میں ایک زندہ انسان کی کھال کھینچنا اور وہ بھی ڈاکٹر خان کی زبان سے پڑھ کر جسم نے جھرجھری سی لی۔ اگر اس زمانے میں ایسی سزائیں نہ دی جاتیں تو حکومتوں کا بچنا مشکل تھا۔ آزادی کے بعد ہم نے اہمسا کو اپنا کر کڑی سزائیں منسوخ کر دیں۔ پھانسی کی سزا کو بھی منسوخ کرنے کے لئے کوشش جاری ہے۔ جس سے آج ہر درندہ صفت انسان آزاد گھوم رہا ہے۔ نہ کسی سزا کا ڈر۔ اور نہ ہی موت کا خوف۔

غیر شائع شدہ

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

سابق پرنسپال۔ بنگلور۔۳۲

قصہ فرعون لعنۃ اللہ علیہ کا اور حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کا

کہتے ہیں کہ فرعون کے باپ کا نام مصعب اور دادا کا نام ملک ریّان تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فرعون کا مصعب بن ولید بن ریّان تھا اور چار سو برس کی عمر اسکی تھی۔ اتنی مدت میں کبھی وہ بیمار نہ ہوا اور سر میں درد نہ ہوا تھا اور نہ کوئی دشمن اس پر غالب ہوا اور فرعون اسکو اس لئے کہتے ہیں کہ خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ نازعات میں فرماتا ہے۔ 'کہا فرعون نے لوگوں سے میں ہوں تمہارا رب سب سے اوپر پس پکڑا اُسکو اللہ نے سزا میں پچھلی کی اور پہلی کی آخرت میں بھی عذاب ہوگا' اور دنیا میں بھی عذاب پایا اوّل اچھا تھا اُس ملعون نے جب دعویٰ خدائی کا کیا تب اللہ نے اسکو بہتّر بلا میں گرفتار کیا۔ اس کی پیدائش بلخ میں ہوئی تھی وہاں سے سیاحت کو نکلا۔ بیوشخنہ ایک شہر کا نام ہے یہاں آیا تب ہامان بے ایمان سے ملاقات ہوئی اور وہ یہاں کا باشندہ تھا فرعون سے اس نے پوچھا تم کہاں سے آتے ہو، کہاں جاؤ گے وہ بولا میں بلخ سے آیا ہوں سیاحت کو نکلا ہوں۔ ہامان نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلونگا۔ سیر کرونگا تب دونوں ملعون مصر میں آئے۔ خربوزے کے ایّام تھے۔ جا کے کھیت والے سے کھانے کا سوال کیا اس نے کہا کہ تم میرے خربوزے شہر میں لے جا کے بیچ آؤ تب میں تمہیں کھانا دونگا۔ تب فرعون ملعون اور ہامان بے ایمان کو یہاں رکھ کے خربوزے بیچنے کو شہر میں گیا۔ دکانداروں نے کہا کہ ہم زر باقی میں بھی پھل پھلاری تر تر کاری سب مول لیتے ہیں نقد میں نہیں پیچھے بیچ کے جسکی جو قیمت پانا ہوتی ہے سودے ڈالتے ہیں ہمارے شہر کا یہی دستور ہے۔ تب فرعون ملعون خربوزے وعدے پر بیچکے وہانسے خالی ہاتھ آیا اور مالک خربوزے سے جا کے کہا کہ یہ کام اچھا نہیں ہے۔ اتنا بول کے وہاں سے پھرا، اور شاہ مصر کو جا کے ایک عرضی دی کہ میں بعید الوطن غریب ہوں کھانے بغیر عاجز ہوں فدوی کو کوئی کام اسی شہر میں جہاں پناہ کے سرکار عالی میں کہ موافق وجہ گذران کے ہو تو غلام کو دے کر سرفراز کریں۔ پس اس بد بخت کا بخت بیدار تھا۔ بادشاہ کا حکم ہوا کہ تو کونسا کام چاہتا ہے۔ وہ بولا کہ داروغی مقبرہ اسی شہر کی چاہتا ہوں کہ بے اجازت میری کوئی مردہ وہاں گاڑنے نہ پاوے تب شاہ مصر نے اس کو شہر مصر میں گورستان کی داروغی دی۔ تب دروازے پر

گورستان کے جا بیٹھا۔ قضائے الٰہی سے ایسا ہوا کہ اُسی سال مصر میں وبا پھیل گئی بہت آدمی مرنے لگے۔ تب فرعون مردود ایک ایک لاش کے پیچھے ایک ایک درم سونے کا لیا کرت۔ تھوڑے دن میں اس کا مال انبوہ روپیہ جمع ہوا بعد اسکے مقربان بادشاہ کو کتنا روپیہ دے کے تمام شہر کی داروغائی لے لی اور وہ شاہ مصر نے جہل سے اس کو پیار کرتا اور خلعت بھی دیتا۔ اتفاقاً قضائے الٰہی سے وزیر مصر کا مر گیا بعد اس کے فرعون کو وزیر مصر کا کیا تب ہامان سے فرعون نے کہا میں چاہتا ہوں کہ خدائی کا دعویٰ کروں کہ ساری خلق آ کے مجھکو پوُجے اور معبود جانے لعنتہ اللہ علیہ۔ ہامان نے اس سے کہا کہ تو اگر خدائی چاہتا ہے تو آہستہ آہستہ پہلے خلق کو ہاتھ میں لے۔ فرعون بولا اس کی کیا تدبیر ہے۔ سب لوگ تو یوسف پیغمبرؑ ابن یعقوبؑ کے دین پر مستحکم ہیں۔ کیسے ان کو لاؤں؟ بعد اسکے یہ تدبی ٹھہرائی۔ بادشاہ کے پاس عرض کی کہ میں چاہتا ہوں کہ اس برس کا خزانہ مصر کی رعیّتوں پر آپ معاف کریں۔ سرکار میں ایک سال کا خزانہ فدوی اپنی طرف سے دے گا۔ بادشاہ نے کہا میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو اور میرا نفع ہو اور میرا نفع اچھا اس سال کا خزانہ رعیّتوں پر تمہاری خاطر سے ہم نے معاف کیا۔ فرعون نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ سرکار عالی کا خزانہ کمتی ہو پس بادشاہ نادان کم فہم تھا فرعون کی خاطر رعیّتوں سے ایک سال کا خزانہ نہ لیا اور کہا کہ اپنے دل کی مراد پوری کر۔ تب فرعون نے دیوان اور خزانچیوں کو بلا کے پوچھا کہ مصر کا خزانہ رعیّتوں سے کتنا وصول ہوتا ہے۔ بولے اتنا ہوتا ہے۔ پس فرعون نے اسی قدر روپیہ اپنی طرف سے خزانہ بادشاہ کی سرکار میں داخل کیا۔ اور دو برس کی معافی کے واسطے بھی ہم نے سرکار عالی میں عرض کی سو بھی قبول ہوئی۔ تب تمام رعایا مصر کی سن کر خوش ہوئی غریب غرباء جتنے تھے فرعون کی ترقی کی دعا کی شکر خدا کا بجالائے۔ پس تین سال کا خزانہ موقوف ہونے سے مصر کی رعایا کو فراغت ہوئی۔ پھر بعد چند روز کے بادشاہ مصر مر گیا۔ اور کوئی والی وارث اس کا نہ تھا کہ اس کے تخت پر بیٹھے۔ بادشاہ کو دفنا کی تین روز تک تعزیت کی اور چوتھے روز تمام شہر کے لوگ قاضی مفتی عالم فاضل غریب غرباء چھوٹے بڑے سب بادشاہی دربار میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ تخت پر کس کو بٹھایا جائے۔ کیونکہ ملک بے سر نباشد چونکہ مصر کے لوگ فرعون سے نیکی دیکھی تھی کہ تین برس کا خزانہ مصر کا معاف کیا تھا اپنے پاس سے روپیہ تین برس کا بادشاہ کو دیا تھا اس لئے سب اس سے خوش تھے یہ

خیر خواہی دیکھ کے سبھوں نے اس مردود کو تخت پر لے جا کے بٹھایا۔ جب ملعون مصر کا بادشاہ ہوا اس ہامان بے ایمان کو اپنا وزیر بنایا تب کہنے لگا اب ملک مصر مسلّم ہمارے ہاتھ آیا۔ ہم بادشاہ ہوئے۔ اب تدبیر ایسی کی چاہیئے کہ خلائق مجھکو خدا کہے اور معبود جانے، میری پرستش کرے لعنۃ اللہ علیہ۔ ہامان بے ایمان نے اس کو یہ صلاح دی کہ پہلے مصر میں یہ حکم دیا چاہیئے کہ علماء فضلا جتنے بھی ہمارے قلمرو میں درس وتدریس نہ دینے پاویں موقوف کردیں۔ تب آہستہ آہستہ وہ اپنے دین سے بے خبر رہیں گے۔ اور جو آئیندہ پیدا ہونگے لڑکے بالے بغیر علم کے سب جاہل ہونگے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ اپنے دین سے برگشتہ ہوجائیں گے۔ پس ہامان بے ایمان کے کہنے پر فرعون ملعون نے اپنے ملک میں تعلیم وتعلم کا باب موقوف کروادیا کہ میرے ملک میں کوئی علم سیکھنے نہ پاوے، درس وتدریس موقوف کریں، نہیں تو ہم ان سب کو قتل کرڈالیں گے۔ تب فرعون کے خوف سے لوگوں نے اپنا پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔ پس چندروز میں سب جاہل بن گئے۔ خدا کو بھول گئے۔ مثل چارپائے وحوش کے ہو گئے۔ بعد اس کے فرعون نے لوگوں کو حکم کیا کہ بتوں کو سجدہ کریں اور پوجیں۔ پس قوم قبطی نے بت پرستی شروع کی۔ یہ سلسلہ بیس برس تک جاری رہا۔ پھر فرعون نے کہا کہ میں نے بتوں کو خدائی دی یہ سب چھوٹے خدا ہیں اور میں بڑا خدا ہوں۔ فرعون نے یہ کہا جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ نے فرمایا ہے فحشر فنادیٰ فقالَ انا ربُّکمُ الاَعلیٰ ۔ ترجمہ پس لوگوں کو جمع کیا پھر پکارا تو کہا کہ میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر، اور اس حالت پر چالیس برس گذرے۔ بعد اس کے سب بتوں کو توڑ ڈالا پھر قوم قبطی نے فرعون کو پوجنا شروع کیا۔ فرعون ان پر نوازش کیا کرتا اور بنی اسرائیل کو تکلیف دیتا وے یوسف کے دین پر قائم تھے اور بعوض جزیہ کے فرعون ان سے قبطیوں کی خدمت کرواتا اور تحقیر کرتا اور جن کاموں کو ناچیز سمجھتا مثلاً محنت اور بار اُٹھانا اور لکڑی چیرنا اور چنا دانا اور گھانس کاٹنا اور جھاڑو کشی کرنا اور گوہ گوبر پھینکنا۔ علیٰ ہٰذ القیاس ان سب کاموں میں مقرر کیا تھا۔ بنی اسرائیل کو شہر اور دیہات میں اپنے تابعین کے خدمت میں بھیج دیتا اور ان کی عورتوں سے اپنی عورتوں کی خدمت لیتا۔ غرض یہ کہ بنی اسرائیل کی عزّت ووقار نہیں کرتا۔ مگر ایک عورت کہ اُس کا نام آسیہ تھا وہ بنی اسرائیل کی قوم سے تھیں وہ اپنے آباواجداد کے دین پر قائم تھیں وہ ماہر وحمیدہ خصال شہرۂ آفاق تھیں فرعون کن کو اپنے

نکاح میں لایا تھا اور بعضوں نے کہا کہ ان کو پرستندہ اپنا جان کے عزّت سے گھر میں رکھتا تھا، مگر وہ اپنے دین میں مضبوط تھیں، خلاف شرع نہیں چلتی تھیں۔ جناب رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ و سلم نے پانچ عورتوں کی پاکی اور بزرگی کو بیان کیا۔ ایک حضرت موسیٰؑ کی ماں اور مریمؑ بنت عمران کی اور خدیجہ الکبریٰ بنت خولید حضرت کی زوجہ اور فاطمہؓ زہرا بنت رسول خداؐ اور بی بی آسیہ رضی اللہ عنہن کہ یہ سب صالحہ تھیں۔ الغرض قوم بنی اسرائیل تیرہ برس تک فرعون کے عذاب میں اور اس کی قوم کی خدمت گذاری میں گرفتار رہے۔ زن و مرد اُس قوم کی خدمت کرتے اور بار برداری میں رہتے اور صبر کرتے پھر بھی اپنے دین کے خلاف نہ چلتے۔ شب و روز استغفار اور خدا کی عبادت کرتے۔ خبر ہے کہ ایک دن فرعون علیہ العنتہ نے دریائے نیل کے کنارے مجلس جشن کی تھی تمام لوگ لشکر کے اپنے ساتھ لے کر خوشیاں اور کھانا پینا کیا اور قوم سے کہا قولہ تعالیٰ وَنَادَ فِرعَونُ فِي قَومِہٖ قَالَ يَا قَومِ اَلَيسَ لِی مُلکُ مصر وھٰذہِ الانھارُ تجری من تحتيِ ط افلا تبصرون o ام انا خیرمّن ھٰذاالّذی ھو مَھین وّلاَ یکادُ یُبینُ ترجمہ اور پارا فرعون اپنی قوم میں بولا اے قوم میری مجھکو نہیں ہے حکومت مصر کی اور یہ نہریں چلتی ہیں نیچے میرے کیا تم نہیں دیکھتے بلکہ بہتر ہو اس شخص سے جسکو عزّت نہیں اور وہ صاف بول نہیں سکتا ہے اتنا بات فرعون نے حضرت موسیٰ کی پر تکبّری سے کہا تھا کہ وہ کیا جانتا ہے اس بات کو لوگوں نے مانا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے فَاستخفَّ قومُہ' فَاطَاعُوہُ ط اِنّھم کانوا قوماً فَاسِقیِنَ ترجمہ پھر عقل کھو دی اپنی قوم کی پھر اُسی کا کہا مانا مقرر ہوئے لوگ تھے قوم فاسق پس چاہا اللہ تعالیٰ نے کہ اُسکو دوزخ میں ڈالے اور اُسکی قوم کو جہنم میں ملا دے تب اسکو چارسو برس کی عمر دی اس واسطے کہ وہ ہر روز باغی ہووے اور نافرمانی کرے تب ایک روز اللہ نے قدرت کاملہ سے اپنی دریائے نیل کو سکھا دیا کچھ پانی باقی نہ رہا تب فرعون کی قوم نے اکٹھے ہو کر اپنے جہل سے اُسکو کہا اگر تو ہمارا خدا ہے تو دریائے نیل کا پانی جاری کر دے۔ جب جانیں گے کہ تو ہمارا رب ہے پس فرعون یہ سُنکے سات لاکھ سوار ہمراہ لے کر میدان سعد الاعلیٰ کی طرف نکل گیا اور ایک ایک کوس پر جا کر ایک ایک لاکھ سوار چھوڑتا گیا اسی طرح سب کو رخصت کر کے تنہا ایک میدان میں جا کے ایک غار میں گھسا اور گھوڑے کی باگ گلے

میں لپٹا قبلہ رخ ہوکر سجدے میں جا گرا اور یہ مناجات کی الٰہی تو ہی حق ہے میں باطل پر ہوں تو میرا رب بے نیاز و بے پرواہ ہے میں دنیا کو بعوض آخرت کے اختیار کیا جو کچھ مجھکو دینا ہے دنیا میں دے میں آخرت کو نہیں چاہتا ہوں سوا دوزخ کے یہ مجھکو خوب معلوم ہے۔ فرعون نے جب خدا کی درگاہ میں یہ مناجات کی اچانک ایک شخص غیب سے آ کے اُس غار کے منہ پر کھڑا ہوا اور فرعون سے کہنے لگا کہ میں ایک شخص کی شکایت تمہارے پاس لایا ہوں تم اس کا انصاف کرو فرعون بولا تو یہاں کہاں سے آیا یہ جگہ انصاف کی نہیں کل دربار میں آئیو انصاف کردونگا آج چلا جا۔ وہ بولا ہمارا یہاں انصاف کردو بے اسکے ہم یہاں سے نہیں ہلیں گے یہ خصومت حال میں واقع ہوئی ہے پس اس گفتگو میں دونوں تھے کہ ذرا دریائے نیل میں کچھ پانی جاری ہوا دریا بھر گیا تب فرعون نے پانی دیکھ کے خوش ہوا اس جوان سے کہا کہ تو کیا چاہتا ہے بول۔ اس نے کہا جو بندہ خدا کی نافرمانی کرے اور حکم اس کا نہ مانے اور وہ خداوند اس پر مہر کرے اس بندے کی کیا سزا ہے فرعون نے کہا اس بندے کو دریائے نیل میں ڈُبا کے مارا چاہئے وہ بولا بہت اچھا آپ ذرا مجھکو لکھ دیویں تا کہ یادداشت رہے کل بندہ آپ کے دربار میں حاضر ہوگا حضور میں اظہار کریگا فرعون بولا یاں دوات قلم کاغذ نہیں ہیں میں کس طرح لکھوں۔ اُس جوان نے کہا میں دیتا ہوں تم لکھو تب فرعون نے اُس غار کے اندر بیٹھ کر خوشی سے لکھ کہ جو بندہ اپنے خداوند کی نافرمانی کرے حکم اس کا نہ مانے اور خداوند اس کو سب طرح سے آرام میں رکھے کھانے کو دیوے تب اس کی سزا یہ ہے کہ دریائے نیل میں اس کو ڈبا کے مارا چاہئے اس طرح کی ایک دستاویز لکھ کے اس جوان کے حوالے کی اور یہ نہ جانا کہ وہ جوان کون تھا بعد اس کے نظروں سے غائب ہوگیا وہ جبرئیل تھے بعد اسکے آواز آئی اے فرعون دریائے نیل کو میں نے تیرے حکم کے تابع کیا تو جب حکم دے گا کہ اے پانی کھڑا رہ تو کھڑا رہے گا اور اگر کہے جاری ہو تو جاری ہوگا تیرے فرمان سے باہر نہ ہوگا۔ تب فرعون یہ سن کر خوش ہوکر میدان سعد الاعلیٰ سے گھر پر چلا آیا اور دریائے نیل کو جس طرح کہتا اسی طرح ہوتا اگر کہتا اے پانی اونچا ہو کے چل تو پانی پہاڑ سے اونچا ہو کے چلتا اور اگر کہتا کہ نیچا ہو کے چل تو نیچا ہو کے چلتا۔ چند روز فرعون کو اللہ نے ایسی کرامات دی تھی باین سبب وہ ملعون دعویٰ خدائی کا کرتا تھا اور کہتا تھا اے لوگو میں مصر کا مالک ہوں اور یہ دریائے نیل میرے تابع ہے دیکھو

تو پانی دریائے نیل کا خشک ہو گیا تھا میں نے جاری کیا تمہارے پینے کے لئے۔ اہل مصر نے جب یہ کرامات فرعون سے دیکھی تعریف کرتے ہوئے سجدے میں گرے اور اسکی ربوبیّت کے مقر ہوئے بولے بے شک تو ہمارا پروردگار ہے لعنتہ اللہ علیہم اجمعین اور ایک مکان عالی شان لبِ دریا بنایا نام اس کا عین اشمس رکھا تھا اس پر ایک حوض بنا کر دریا کے پانی کی نہر اس پر جاری کی تھی اور اس پر چار ستون سونے کے بنائے۔ اس طرح پر کہ حوض کا پانی ستونوں پر سے کوشک پر جا کر دوسری راہ نکل پڑتا تھا۔ اور حق تعالیٰ نے دو درخت اس حوض کے کنارے پر پیدا کئے تھے ایک درخت سے روغن زرد نکلتا تھا اور دوسرے سے روغن سرخ وہ روغن جس بیمار اور آزاری کو دیتا خدا کے فضل سے وہ شفا پاتا تب فرعون ان دونوں درختوں کے سبب خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور ربوبیت کی دلیل ان دونوں درخت سے دیتا کہ میری ربوبیت کی یہ دلیل ہے پس خلق اللہ اور بھی دونوں درخت کی کرامت سے فرعون کی ربوبیت کے قائل ہو کے گمراہ ہوتے چلے گئے۔

بیان تولّد ہونا حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کا

ایک رات فرعون نے خواب دیکھا کہ وہ دو درخت عالم بالا پر گئے اور سارا عالم ان کے زیر ہوا۔ صبح کو اٹھکر تمام حکیموں اور منجموں اور جادوگروں کو بلا کر پوچھا کہو تو اسکی تعبیر کیا ہے وہ بولے ہم اپنی اپنی کتاب میں دیکھتے ہیں۔ پھر بیان کیا کہ بنی اسرائیل کی قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا کہ وہی تمہاری مملکت خراب کرے گا۔ اور سب لوگ اس کے ہوں گے ملک و میراث مال و نعمت کل اسک ہاتھ آوے گا یہ سن کر فرعون ہراسان ہو کر بولا کب وہ لڑکا پیدا ہوگا۔ اس تین رات اور دن میں باپ کی پشت سے ماں کے رحم میں آویگا فرعون نے حکم دیا کہ جتنے بنی اسرائیل ہیں آج سے کوئی اپنی جورو کے ساتھ ہم بستر نہ ہونے پائے۔ منادی کر دو۔ عدول حکمی کرے گا اسکو مار ڈالوں گا۔ پس ایک ایک آدمی بنی اسرائیل کے گھروں میں متعین کیا۔ تب فرعون کے ڈر کے مارے کوئی اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرتا۔ مگر تقدیر الٰہی سے چارہ نہ تھا باوجود اس تنبیہ اور تہدید کے ان تین دن کے اندر نجومیوں نے کہا تھا روز معہودہ میں وہ لڑکا یعنے حضرت موسیٰ علیہ اسلام تولّد ہوئے۔ شرح اسکی یہ ہے کہ خاتون نام عمران کی بی بی تھی وہ بنی اسرائیل کے قوم سے تھی آگے ایک بیٹا اس سے تولّد ہوا اس کا نام ہارون اور

ایک بیٹی نام اس کا مریم تھا اور عمران فرعون کے ندیموں میں سے تھا اس دن فرعون کے پاس حاضر تھا ۔بی بی خاتون کی شوق مباشرت کا ہوا ایسا کہ صبر وقرار جاتا رہا آخر نہ ٹھہر سکی رات کو آٹھ گھڑی کے وقت گھر سے نکلکر فرعون کے دروازے پر جا پہنچی۔مرضی الٰہی سے سب دروازے کُھلے ہوئے پائے دربان اور نگہبان کو سوتے دیکھا اُس دن اللہ تعالیٰ نے اُن پر خواب کو غالب کیا تھا وہ خاتون بے کھٹکے فرعون کی خوابگاہ میں جا پہنچی اپنے شوہر کو دیکھا کہ فرعون کے نگہبانی میں کھڑے ہیں فرعون سوتا ہے تب عمران کو اپنی بی بی کو دیکھ شوق مباشرت کا زیادہ ہوا وہاں سے سرک کے زن وشوہر دونوں نے مجامعت سے فرغت کرلی اُسی گھڑی موسیٰؑ اپنے باپ کے صلب سے ماں کے رحم میں آئے بعد اس کے بی بی خاتون وہاں سے اُٹھکر اپنے گھر کی طرف چلی آئیں ۔پس یہ بھید کسی کو معلوم نہ تھا سوائے رب العالمین کے کہ وہ سر باطن کی خبر رکھتا ہے۔جب صبح ہوئی فرعون نے نجومیوں کو بلا کے پوچھا کہو تو وہ لڑکا پیدا ہوا یا نہیں ۔تب انہوں نے کچھ گن کے کہا کہ وہ لڑکا کل شب گذشتہ کو باپ کے صلب میں سے ماں کے رحم میں آچکا ہے تب فرعون نے چوکیداروں کو حکم کیا کہ اگر کوئی بھی لڑکا بنی اسرائیل کی قوم میں پیدا ہو تو مار ڈالیو لڑکی کو نہیں اور ستر درم بعوض خون کے اس کے ماں باپ کو دیجیو ۔پھر اتفاق ایسا ہوا کہ روپیوں کے لالچ سے ماں باپ اپنے بیٹے لاڈلے کو لاکے فرعون کے پاس دیتے فرعون کے حکم سے وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے مار ڈالتے فرعون نے ہر ہر گھر میں بنی اسرائیل کے ایک ایک قبطی کو تعینات کیا اگر بیٹا پیدا ہوتا تو مار ڈالتا اگر بیٹی پیدا ہوتی تو نہ مارتا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے’اور جب چھڑایا ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے کہ دیتے تم کو بڑی تکلیف ذبح کرتے تمہارے بیٹے اور جیتا رکھتے تمہاری عورتیں اور اس میں مدد ہوتی تمہارے رب کی بڑی۔‘پس چند سال بنی اسرائیل کو فرعون ملعون نے دکھ میں رکھا تھا اور انکے بیٹوں کو قتل کرتا اور اسکی طرف سے عورتیں انکی عورتو نکی پیٹ پر ہاتھ پھیرتیں غیر محرم آکے حمل دیکھتے کہ پیٹ سے ہے یا نہیں اور حضرت موسیٰ کی ماں حمل سے تھیں ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ وہ روٹی پکا رہی تھیں اس وقت درزہ ہوا موسیٰ علیہ السلام تولّد ہوئے مانند شب چہاردہم کے انکے نور سے سارا گھر روشن ہوا جو انکی طرف دیکھتا آنکھیں خیرہ ہو جاتیں بعد اس کے فرعون کے لوگ آپہنچے اور حضرت کی والدہ اندیشہ کر رہی تھیں کہ یا اللہ اس بچہ کو میں کہاں لے جا کے

چھپاؤں فرعون کے لوگ دیکھ کر میرے بچے کو مار ڈالیں گے تو پناہ دے یہ کہتی تھیں آخر تنور کی آگ میں لڑکے کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر ڈالدیا اور ایک دیگ خالی اسکے اوپر چڑھادی بعد اس کے فرعون کے لوگوں نے آکر خاتون کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا کے دیکھا تو اثر حمل کا نہ پا کے چلے گئے اور خاتون دردفرزندی سے اپنے رونے لگیں اور طمانچے اپنے گالوں پر مارتی رہیں کہ میں کیوں بچے کو چولھے میں ڈالدیا اپنے پاؤں پر تیشہ مارا اب تو لڑکا جل گیا اگر اسکی ہڈی بھی رہتی تو اس سے اپنے دل مجروح کی دوا کرتی بعد اس کے جب اسکو چولھے کے اندر دیکھا تو آگ میں سے ایک سیب ہاتھ میں لئے کھیل رہا ہے یہ حال دیکھ کر متعجّب ہوئیں اور شُکر خدا کا بجالائیں۔ پس انکو تنور میں سے اُٹھالیا پھر متفکر ہوئیں کہ لڑکے کو کہاں چھپا رکھوں ایسا نہ ہو کہ فرعون کے لوگ لے جاکے مار ڈالیں۔ یہ کہہ کر روتی تھیں۔ تب خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ فرمان ہوا اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰؑ کی ماں کو کہ اُسکو دودھ پلا پھر جب تجھکو ڈر ہو تو اُس کا، تو ڈالدے اسکو دریائے نیل کے پانی میں اور خطرہ نہ کر اور غم نہ کھا ہم پھر پہنچاویں گے اُس کو تیری طرف اور کریں گے اسکو رسولوں سے' تب حضرت کی والدہ یہ بشارت پا کے بہت خوش ہوئیں اور ایک صندوقچہ بنانے کے لئے بڑھئی کی تلاش کو نکلیں فوراً جبرئیل بصورت بڑھئی کے ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے بولیں تم صندوقچہ بنانا جانتے ہو۔ وے بولے جانتا ہوں تب جبرئیل اُنکے گھر جاکے ایک صندوقچہ بنا کے چلے گئے پس حضرت کی ماں نے اُنکو خوب دودھ پلایا ،حریر کے کپڑے میں لپیٹ کے صندوقچہ میں رکھ کر قفل کر کے دریائے نیل میں ڈالدیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ جب موسیٰ کی ماں چپکے سے بڑھئی کو گھر میں لائیں اُس سے کوئی آگاہ نہ تھا مگر ایک شخص ہمسایہ وہاں کا اس راز سے مطلع تھا حضرت موسیٰ کی والدہ نے مارے خوف کے ستّر دینار بطور رشوت کے دے کر رخصت کیا اور اس سے کہا کہ قسم ہے تم اپنے رب کی یہ راز کسی سے مت کہئیو اور بڑھئی کو ستّر دینار اُجرت اُسکی دیکر رخصت کیا اور اُس ہمسایہ نے جو بی بی خاتون سے روپیہ لے کر کھایا تھا جاکے فرعون سے لڑکے کی بات کہدے اور اس سے کچھ لیوے کہ خدمت اور نعمت سے اس کی سرفرازی ہووے آخر فرعون کے گیا چاہتا تھا کہ وہ راز اس کو بتادے اُسی وقت زبان اس کی گونگی ہوگئی جب فرعون کے پاس سے نکل آیا پھر زبان کھل گئی پھر قصد کیا جاکے بولے پھر گونگا ہو گیا زبان

بند ہوئی پھر باہر آیا زبان کھل گئی۔ نقل ہے کہ اسی طرح سات بار قصد کیا تھا ساتوں مرتبہ زبان بند ہوگئی تھی پھر بھلی ہوئی تب اس سے باز آیا۔ اور توبہ کی خدا پر ایمان لایا اور یہ بات بھی کس سے نہ کہی آخر موسٰی کی ماں نے موسٰی کو صندوقچہ میں رکھ کے دریائے نیل میں ڈال دیا اور موسٰی کی بہن مریم کو کہدیا اے بیٹی تو اس صندوقچہ کو دیکھتی ہوئی پیچھے پیچھے دریا کنارے سے چلی جا ایسا نہ ہو کہ تجھکو کوئی دیکھے جیسا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے' اور کہدیا اسکی بہن کو اسکے پیچھے چلی جا پھر وہ دیکھتی رہی اسکو اجنبی ہوکر اور خبر نہ ہوئی پس خدا کے حکم سے وہ صندوقچہ پانی پر بہتا ہوا نیل کے دریا سے اس نہر کے اندر سے فرعون نے اپنی کوٹھی کے پاس محل کے اندر ایک حوض بنایا تھا وہاں جا ٹھہرا اور اسوقت فرعون اپنی بی بی آسیہؓ خاتون کو ساتھ لے کر تخت پر بیٹھا تھا نظر اس پر جا گری فرعون بولا اے بی بی کیا چیز پانی پر بہتی ہے دونوں نزدیک جا کے دیکھتے ہیں کہ ایک صنوقچہ ہے فرعون نے چاہا کہ صندوقچے کو اٹھالے اُسکے ہاتھ نہ آیا کیونکہ فرعون مردود کافر تھا پلید کے ہاتھ سے نہ اٹھا پیچھے آسیہؓ خاتون نے آکے صندوقچہ کو حوض سے اُٹھالیا اور فرعون کے آگے لاکر رکھا فرعون نے بہتیرا چاہا کہ کھولے مگر اس سے صندوقچہ نہ کھلا آخر آسیہؓ خاتون مومنہ تھیں دل سے بسم اللہ پڑھ کر فرعون کے سامنے جھٹ سے کھول دیا اس میں دیکھا کہ ایک لڑکا مہتاب صورت ہے اسکے نور سے سارا گھر فرعون کا روشن ہوگیا یہ دیکھ کے فرعون کے دل میں اسکی محبت آ گئی۔ خدائے تعالٰی نے موسیٰ کو ایسی نیک صورت دی تھی کہ جو کوئی اسکی طرف دیکھتا فریفتہ ہوجاتا پس آسیہؓ خاتون بنی اسرائیل تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کی چچیری بہن تھیں اور وہ پہچانتی تھیں اپنے خویش و برکوتب فرعون سے بولیں کہ یہ لڑکا تمہارا اور میرا نور چشم ہے اس کو نہ مارنا ہم پالینگے جیسا کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے' اور بولی فرعون کی عورت آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یہ لڑکا مجھکو اور تجھکو اسکو نہ مارو شاید ہمارے کام آوے یا ہم اسکو کرلیں بیٹا اور وے نہ سمجھتے تھے' یعنے خبر نہ تھی کہ وہ لڑکا بڑا ہوکر کیا کرے گا لیکن جانتا تھا کہ یہ لڑکا بنی اسرائیل میں سے ہے کسی نے خوف ڈالا ہے پر لڑکا نہ مارا تو کیا ہوا یہ سمجھ کے نہ مارا پس فرعون کی ایک بیٹی تھی کہ اسکو بیماری برص کی تھی اس نے آکے دیکھا لڑکا رو رہا ہے اور منہ سے رال گرتی ہے جلدی سے آکے گود میں اُٹھالیا خدا کے فضل سے اور موسیٰ کی برکت سے جب اس کا لعاب لگا اس کا بدن بھلا ہوگیا برص کی بیماری جاتی رہی تب فرعون نے اس کو پیار

کر کے گودی میں لیا اور دائی دودھ پلانے کو مقرر کی بہت سی دائیاں آئیں اس نے کسی کا دودھ نہ پیا چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' اور حرام کردی ہم نے اوپر اس کے دودھ دائیوں کا پہلے سے پس خواہر موسیٰ وہاں موجود تھیں وہ بولیں میں بتاؤں نہیں ایک گھر والی کو کہ پالے اسکو واسطے تمہارے اور واسطے اس کے بہت خیر خواہ ہے۔' فرعون نے کہا لے آؤ اسکو تب وہ دوڑیں اپنی ماں کے پاس جا کے بولیں اے ماں میری خدا نے مہر کی ہے ہم پر چلو بھائی کو دودھ پلانے فرعون بلاتا ہے اُسے نہیں معلوم کہ وہ تمہارا بیٹا ہے اور دائیوں کو بلایا تھا مگر وہ کسی کا دودھ نہیں پیتا ہے تم چلو میں نے اجنبی ہو کے تمہاری بات فرعون سے کہی ہے کہ میں دودھ پلانے والی ایک دائی لادوں گی تب موسیٰ کی ماں خوش ہو کر فرعون کے گھر آئیں دیکھا بہت سی دائیاں جمع ہیں کسی کا دودھ نہیں پیتے ہیں جب ان کی والدہ نے جا کے گود میں لیا تب دودھ پینے لگے اور موسیٰ کی ماں خوش ہو کر فرعون اور گھر والوں سے کہنا چاہتی تھیں کہ یہ میرا بیٹا ہے تب فوراً اللہ کی طرف سے ان کے دل میں القا ہوا کہ اے خاتون یہ راز کسی پر مت کھولیو اپنا بیٹا کر کے کسی سے مت بولیو ہامان پلید نے وزیر فرعون کا تھا اسنے کچھ شمّہ اس کا قرینہ قیاس سے دریافت کیا تھا وہاں کھڑا ہو کے دیکھتا تھا تو حضرت کی ماں سے پوچھا اے دائی یہ لڑکا شاید تمہارے بطن سے ہی معلوم ہوتا ہے وہ بولیں نہیں مگر یہ لڑکا میرے دودھ سے بہت خوش ہے پس فرعون نے ان سے کہا کہ تم اپنے دودھ پلانے کی اجرت ہر روز ایک دینار ہم سے لیا کرو تب موسیٰ کی والدہ فرعون سے اجرت دودھ پلانے کی مہینے میں تیس دینار لیا کرتیں اور اپنے بیٹے کو دودھ پلاتیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' پھر پہنچا دیا ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کی طرف ٹھنڈی ہے اسکی آنکھ اور غم نہیں کھاوے اور جانے کے وعدہ اللہ کا ٹھیک ہے ولیکن اکثر انکے نہیں جانتے'۔ اسی طرح چند روز گذرے ایک دن موسیٰ کو فرعون دیکھ کے خوش ہوا، گودی میں لیکر منہ پر بوسہ دینے لگا حضرت نے ایک ہاتھ سے اس کی ڈاڑھی کو پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے منہ پر ایک طمانچہ لگایا فرعون نے اسی وقت غصہّ میں آ کر حضرت کو مار ڈالنے کا حکم کیا اور بولا کہ شاید یہ وہی لڑکا ہے کہ جس کے ہاتھ سے میرا ملک برباد ہوگا آسیہ خاتونؓ نے کہا اے فرعون تم نہیں جانتے کہ شیر خوار بچوں کا یہی فعل ہے انکو سمجھ بوجھ نہیں ہوتی یہ لڑکا بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے جو تم خیال کرتے ہو اور تم نے تو تمام بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار ڈالا ہے پس اس کے

آزمانے کے لئے ہامان نے دوطشت زر کے ایک میں انگارے آگ کے اور دوسرا یاقوت سرخ سے بھر کر حضرت موسیٰ کے سامنے لا رکھا اور بولا اگر لڑکا آگ کی انگیٹھی میں ہاتھ ڈالیگا تو یہ لڑکا بنی اسرائیل میں سے نہیں اور اگر یاقوت کے طشت میں ہاتھ رکھے گا تو یہ وہی لڑکا ہے جو ہمارا دشمن ہے۔ پس موسیٰ نے چاہا کہ یاقوت کے طشت میں ہاتھ ڈال دیں اسی وقت اللہ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام نے آکر ان کا ہاتھ پکڑ کے انگیٹھی میں ڈالدیا پس حضرت نے ذراسی آگ پکڑ کے منہ میں رکھا کچھ زبان مبارک جل گئی تب آسیہ خاتونؓ نے فرعون سے کہا کہ تم نے دیکھا کہ بچہ نے آگ پکڑ کے اپنے منہ میں ڈال لی یہی خصائل لڑکوں کے ہیں تب فرعون انکو گود میں لے کر پیار کرنے لگا اور ان کے ماں کے حوالے کیا۔ مروی ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان طفولیت میں فرعون کے گھر جل گئی تھی صاف گفتگو نہیں کر سکتے تھے جب بڑے ہوئے نوکر چاکر فرعون کے اپنے ساتھ لے کر شہر میں پھرایا کرتے تھے لقب آپ کا پسر فرعون تھا اور کبھی فرعون ملعون انکا ہاتھ پکڑ کے سامنے بٹھا کے اکثر باتیں علم وحکمت کی لب شیریں سے ان کے سنتا اور بہت پیار کرتا جب حضرت کی عمر بیس برس کی ہوئی تب فرعون نے ان کو بڑی شان وشوکت سے بیاہ دیا اس میں دولڑکے پیدا ہوئے اور نام ان دونوں کا حرثونؔ اور بلقاؔ تھا اور حضرت موسیٰ ہجرت کی اور حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس گئے۔

غیر شائع شدہ

مردحریت کی دلربا داستان

ڈاکٹر سی۔وائی لیس۔خان (کلوز پیٹ یوسف سمیع اللہ خان) کے جدامجد مجید خاں، سلطان ٹیپو کے محکمہ راکٹ میں ایک سائنسدان کے چشم و چراغ ہیں۔ وراثت میں ملی اس خداداد ذہانت کا کیا کہنے کہ ان کے اجداد نے حضرت ٹیپو سلطان کو راکٹ جیسی انوکھی چیز ایجاد کر کے دی جس سے انگریزوں نے کافی ہزیمت اٹھائی، اب نہیں کے خاندان کے سپوت نے چار سال کی انتھک کوششوں سے ایکیسویں صدی کے آخری دہائی میں کافی محنت، جستجو اور لگن سے تاریخ میسور سلطنت خداداد کا پہلا حصہ نواب حیدر علی بہادر پر مبنی شائع کیا اور دوسری دہائی کے اوائل میں اس کا دوسرا حصہ مردحریت ٹیپو سلطان شائع کیا۔

استاذ الاساتذہ ڈاکٹر بی شیخ علی صاحب مدظلّہُ العالی نے اس کتاب کے اوائل میں لکھا ہے کہ ''ہمیں یہ بھی یاد رکھنا ہے ؎

چمن میں ایک دن شاہ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی، شور تھا غل تھا

خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار حسرت کے

بتاتا باغباں رو رو، یہاں غنچہ، یہاں گُل تھا

باغباں ڈاکٹر خاں رو رو کر یہاں بتا رہے ہیں کہ یہاں غنچہ تھا یہاں گل تھا''۔'' پھر ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کہا کہ ایسا کرشمہ ایسا اعجاز کسی پروفیشنل ڈاکٹر نے نہیں کر دکھایا، اور آپ نے ''تاریخ میسور سلطنت خداداد کو نادر و نایاب تصنیف گردانا ہے۔'' بالکل صحیح کہا ہے۔

مردحریت سلطان ٹیپوؒ ڈاکٹر سی وائی لیس خان کی وہ کتاب ہے جس میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کی داستان دلربا بیان کی گئی ہے۔ سلطان کی شہادت سے لیکر آج تک حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ پر ان گنت کتابیں کچھ موافقت میں اور مخالفت میں ملک اور بیرون ملک منظر عام پر آچکی ہیں اور انشاء اللہ تا قیامت کئی اور صداقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے آتی رہیں گی۔ اس لئے کہ سلطان نے جو

کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ ہمیشہ جاری و ساری رہیں گی ۔ ہند کا یہ مایہ ناز سپوت حریت، آزادی اور رفاہ عامہ کے لئے اس سرزمین کی آبیاری اپنے خون سے کی ہے ۔اس شخصیت نے ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ برپا کرنے کی کوشش کی ۔ہم وطنوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ملک اور قوم کی آبرو اتفاق واتحاد ہے ۔اسی لئے ہم سارے ہندوستانیوں کو متحد ہوکر ہندوستان کو غیر ملکی تسلط سے بچانا ہے ۔لیکن آپسی چپقلش، رنجشوں، حسد، بغض اور تعصب نے ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ وہ غلامی کا طوق پہنے بغیر نہ رہ سکے ۔غداران وطن نے دشمنوں کے سبز باغ دکھانے پر خوش ہوکر انکا بھرپور ساتھ دیا، وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ ان سے کھلواڑ کررہے ہیں ۔نتیجہ یہ ہوا کہ وطن کو غیر ملکیوں کا غلام بنایا اور خود بھی ذلت ورسوائی کی زندگی جیتے رہے یا ذلت کی موت مرے ۔ملک غلام بن گیا، دوصدیوں تک فرنگی درندوں کی غلامی، درندگی اور استحصال کو سہتا رہا۔

سلطان کا بنیادی مقصد ہندوستان کی آزادی اور جمہوریت تھا۔حریت، آزادی سلطان کا عظیم خواب تھا۔اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے انہوں نے تن تنہا دشمنان ملک سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا ۔سلطان کا یہ کارنامہ اس دور کے مشہور تاریخ ساز ہستیوں جیسے نپولین بوناپارٹ، تھامس جیفرسن، جارج واشنگٹن وغیرہ میں انہیں ممتاز بنادیتا ہے ۔اپنی ۲۲ رسالہ دور حکومت میں سلطان نے عوامی فلاح و بہبود کے جتنے وسائل تھے اپنی رعایا کی خوشحالی اور امن وچین کے لئے استعمال کئے جیسے زراعت، صنعت وحرفت، معاشی ترقی، سماجی اصلاح، انسانی فروغ، عدل وانصاف وغیرہ ۔ایشیا میں جمہوری نظم ونسق کو لاگو کرنے والے سب سے پہلے سلطان ہی تھے جنہوں نے جیاکوبن کلب کی بنیاد ڈالی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ حکومت کو ذاتی ملکیت کے بجائے عوام کو سونپ دی جائے اور خود نگہبانی کرے ۔جیسا کہ آج ہندوستان میں عوامی نمائندوں کی نگہبانی صدر ہند کیا کرتے ہیں ۔

سلطان ایک بہت اعلیٰ انجینیر بھی تھے، زرعی ترقی کے لئے دریائے کاویری پر تین ڈیاموں، سدّ محی، سدّ محمدی اور سدّ منعم بنانے کی پلاننگ کی تاکہ دریائے کاویری کے پانی کو منظّم طریقہ سے استعمال میں لایا جاسکے اور رعایا اس سے مناسب فائدہ اٹھائے ۔سلطان کی انجنیرنگ کا کارنامہ

ان کے دور کی عمارتوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔جس میں اکثریت مضبوط قلعوں کی ہے۔سلطان کی ایماء پر قلعے،راستوں پر چوکیاں،محلات مساجد منادر کی تعمیر ہوئی۔

ڈاکٹر سی وائی یس خان واقعی قابل مبارکباد ہی جنہوں نے اپنے پیشہ کی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کی تصنیف پر چار سال کی انتھک کوشش سے تاریخ میسور کے دونوں حصے مکمل کرنے کی سعئ مشکور کی۔کیونکہ تاریخ سے آپ کو بہت دلچسپی ہے۔ان کا دلچسپ افسانوی انداز قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔تاریخی حقائق کو انتہائی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ڈاکٹر خان cosmology and Trichology کے specilist ہیں۔زلفوں کی صحتمندی اور آسائش اور چہرے کی خوبصورتی کا علاج کرتے ہیں۔آپ نے اسی specilazation کا استعمال کرتے ہوئے سلطنت خداداد پر دشمنوں کے لگائے ہوئے داغ دھبوں کا علاج کر کے اس کی زلفوں کو سنوارا ہے۔اس کے حسن میں نکھار پیدا کیا ہے۔ لیکن کیا جائے سلطان کے غداروں کی نسل اب بھی چل رہی ہے۔آج بھی اس شخصیت کو مسخ کرنے کے لئے مختلف حربے آزما رہی ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

آپ محبّ اردو ہیں۔حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے والہانہ محبت ہے۔اسی محبت نے سلطنت خداداد کے تفصیلی حالات لکھنے پر مجبور کیا۔سلطنت خداداد سے متعلق بڑی اہم اور پر مغز معلومات فراہم کی ہیں۔سلطان کی مملکت کا دورہ کر کے ان کی ایک ایک نشانی کو کیمرہ میں قید کیا۔اور ان کو کتابوں میں منتقل کر کے اس کو چار چاند لگا دئے۔ان کی لی ہوئی نادر تصاویر کو کتابوں کے ہر صفحہ پر آپ دیکھ سکیں گے۔جو بذات خود ایک مستند حوالہ ہے اگر ان تصویروں کو یکجا کر لیا جائے تو وہ خود ایک مستند دستاویز بن جاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا پہلا حصہ دنیا کے اکثر کتب خانوں میں پہنچا دیا ہے۔اگر وہ چاہتے تو اس کو بیچ کر نفع بھی کما سکتے تھے۔ہمارے غیر اردو داں ہموطنوں تک اس کی رسائی بذریعہ ترجمہ ہو جاتی تو آپ کی محنت اور رنگ لاتی۔امید کہ ڈاکٹر صاحب اس بات پر توجہ دیں گے۔آج ہماری ریاست میں سلطان جیسی عظیم شخصیت کے نام پر کئی ادارے اور انجمنیں قائم ہیں۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے وہ کام انجام دیا ہے وہ اس عظیم ہستی کے شایان شان اور ضروری

تھا۔کرناٹک اردو اکاڈمی نے اسے حال ہی میں شائع کیا ہے۔اس کتاب کی اشاعت پر ڈاکٹر خان اور اکاڈمی دونوں قابل مبارکباد ہیں۔امید کہ ادبی حلقوں اور ادیبوں میں اس کی خوب پذیرائی کی جائے گی۔

بنگلور

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

۲۶/اکتوبر ۲۰۱۳ء

سابق گورنمنٹ ڈگری کالج پرنسپال

روزنامہ سہارا میں شائع ہوا

’۵۸واں یوم تاسیس کرناٹک‘ میں حیدرعلی پر اعتراض کا جواب

۲نومبر کے سالار میں چاند اکبر کا مضمون ۵۸ واں یوم تاسیس کرناٹک باصرہ نواز ہوا۔ مضمون نگار نے ریاست کرناٹک کے محل وقوع، اس کا جغرافیہ تاریخی، سیاسی ومعاشی پس منظر میں ۱۹۵۶ءتا امروز جائزہ لیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ سمندر کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ مضمون جامع اور بڑا لچسپ ہے۔ اس کی اشاعت پر روز نامہ سالار اور چاند اکبر دونوں قابل مبارکباد ہیں۔

ریاست کی تاریخ بیان کرتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے کہ ’’۱۳۹۹ میں یدورایا نے میسور کی بنیاد ڈالی۔ راجہ وڈیار ۱۵۷۸ تا ۱۶۱۲ تک حکمرانی کی، چھوٹی ریاست کو بڑی ریاست میں تبدیل کیا سری رنگا پٹن کو پایہ تخت بنایا۔ وڈیار سے حیدرعلی نے حکومت چھین لی۔‘‘ یہ جملہ حیدرعلی پر غاصب ہونے کا الزام عائد کررہا ہے۔

جبکہ تاریخ بتاتی ہے کہ میسور کا راجہ نہایت کمزور تھا اور اسکا وزیراعظم نندراج اور اس کا بھائی دونوں حکومت پر حاوی ہوگئے تھے۔ راجہ اور رانی کا حکم صرف محل میں چلتا تھا۔ حیدرعلی کو نندراج نے اپنے سرپرستی میں ان کے جوہر کو دیکھ کر سپہ سالار بنایا۔ رانی دیواجی منی نے دیکھا کہ حیدرعلی کا فوج پر مضبوط قبضہ ہے تو انہوں نے ان کو بلایا اور درخواست کی کہ کیسے بھی ہو نندراج سے چھٹکارا دلائیں، حیدرعلی کے لئے یہ نازک مسئلہ تھا راجہ سے نمک حرامی وہ نہیں کرستے تھے اور نہ ہی نندراج جیسے محسن کو چھوڑ سکتے تھے جس نے انہیں آج یہ مقام دیا تھا۔ حیدرعلی نے حکمت عملی سے نندراج کو سمجھایا۔ نندراج انتہائی چالاک تھا حیدرعلی کی مصلحت کو سمجھا اور وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہوکر اپنی ذاتی جاگیر میں جابسا۔ اس واقعہ کے بعد حیدر سے ناراض ہونے کے بجائے نندراج کو ان سے اور زیادہ محبت ہوگئی اور میسور کا راجہ بھی خوش ہوکر حیدرعلی کو ’’فرزندار جمند‘‘ کا خطاب عطا کیا۔ ایسے وقت میں حیدرعلی جبکہ نندراج اور ان کا بھائی میسور کے راجا کو ہٹا کر خود راجہ بننے کی سوچ رہے تھے اگر حیدرعلی نہ ہوتے تو

میسور کا خاندان کب کا مٹ گیا ہوتا۔ چند دنوں بعد یعنی اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں حیدر آباد آپسی سازشوں کا شکار ہوا، صلابت جنگ کو قید کر لیا گیا بسالت جنگ اور میر نظام علی ریاست کے حکمران بن گئے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی شکست فاش کے بعد بسالت جنگ صوبہ سرا کو حاصل کرنے کے لئے سرا کی طرف چل پڑا راستہ میں ہسکوٹہ کا محاصرہ کر لیا لیکن فتح کرنے میں کافی تاخیر ہونے سے حیدر علی کی مدد چاہی۔ حیدر علی بسالت جنگ کی کمزوری کو جان گئے تھے کہ ان کی مدد کے بغیر ان سے قلعہ فتح ہونے والا نہیں۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بسالت جنگ سے یہ معاہدہ کیا کہ قلعہ فتح ہونے کے بعد قلعہ میں موجود سامان وہ لے جائے اور ہوسکوٹہ اور اطراف کا علاقہ انہیں دے دیا جائے۔ بسالت جنگ قلعہ کے محاصرہ سے تنگ آ چکا تھا اس نے نہ صرف شرط مان لی بلکہ یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ دلی میں موجود مغلیہ سلطنت سے سرا کی صوبیداری کے لئے سفارش کرے گا۔ چنانچہ حیدر علی نے اپنی فوج کے ساتھ چند ہی دنوں میں ہوسکوٹہ کا قلعہ فتح کر لیا۔ معاہدہ کی رو سے شہنشاہ ہندوستان نے ایک سفیر خاص کے ذریعہ حیدر علی کے نام کی صوبیداری کا فرمان روانہ کیا۔ فرمان کے ساتھ ساتھ ہیرے جواہرات تحفہ تحائف، نقارہ، نشان عطا ہوا۔ پھر کیا تھا سرا کا پورا علاقہ جنوبی ہندوستان کا سب سے بڑا علاقہ حیدر علی کی ماتحتی میں آ گیا تمام پالیگاروں نے حیدر علی کو خراج دینا منظور کر لیا اب وہ سری رنگا پٹن کے ملازم نہیں سرا کے نواب تھے اور سری رنگا پٹن جیسی بہت سی ریاستیں ان کے ماتحتی میں تھیں۔ میسور بھی سرا کا باجگدار ہونے کی حیثیت سے حیدر علی تک تابعدار اور ماتحت تھا۔ حیدر کے خلاف کوئی بھی غلط قدم بغاوت تھی۔ میسور کی رانیوں نے پھر سازش کر کے حیدر علی کے پروردہ کھنڈے راؤ کو اپنی طرف ملا لیا اور چاہا کہ جس طرح نند راج کو ہٹایا گیا اسی طرح حیدر علی کو بھی مرہٹوں کی مدد سے ہٹا دیا جائے۔ اس سازش کے تحت پونہ نے ایسا جی پنڈت کو اس مہم کے لئے روانہ کیا حیدر علی کو ان ساری باتوں سے لاعلم رکھا گیا۔ مرہٹوں کو بتا دیا گیا تھا کہ حیدر علی کو یا تو قتل کر دی یا انہیں گرفتار کر لیں۔ کھنڈے راؤ جو ان کا سکرٹری رہ چکا تھا اس نے اس بات کا پورا التزام کیا کہ کہیں حیدر علی جانے نہ پائیں۔

حیدر علی کے جان نثاروں نے چپکے سے ان کو سازش کی خبر دے دی۔ حیدر علی نے اپنے

چند دوستوں کی ان کے کنبہ کیذ مہ داری دے دی اور راتوں رات فرّ رہو گئے۔ عام راستہ سے ہٹ کر قلعہ پرکا ویری ندی میں برستوں کیوجہ طغیانی آئی ہوئی تھی پرواہ کئے بغیر چھلانگ لگا دی اور بنگلور میں ان کا فوجی دستہ موجود تھا جا کر شامل ہو گئے۔ سرنگا پٹن میں صبح جب حیدر علی کی فرار ہونے کی خبر پہنچی تو مرہٹہ اور کھنڈے راؤ ان کے تعاقب میں نکل پڑے۔ حیدر علی نے اپنے خاص ملازم سید مخدوم کو جنہیں فرانسیسیوں کی مدد کے لئے بھیجا گیا تھا فوراً بلا لیا۔ مرہٹے بھی تعاقب کرتے بنگلور پہنچ گئے۔ حیدر علی اپنی فوج کے ساتھ قلعہ بنگلور سے باہر نکل آئے اور مرہٹوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا فتح حاصل کی اس جنگ کی خبر جب سری رنگا پٹن پہنچی تو راجہ رانیوں کو بہت صدمہ پہنچا ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ حیدر علی مرہٹوں کی اتنی بڑی فوج کو کچل کر رکھ دیں گے انہیں یقین ہو گیا کہ میسور کی ریاست جو چند قریوں پر مشتمل تھی اس کا کیا ہو گا۔ مرہٹوں کی شکست کی خبر پھیلی نندراج بھی یہ خبر سن کر ایسا جی کو خط لکھا کہ کھنڈے راؤ غدار ہے جس نے سازش کر کے خود انہیں حکومت سے بھگانے کی کوشش کی، جب نند راُ اور حیدر علی کو دھوکہ دے کر رانیوں سے مل سکتا ہے تو کیا ایسا ممکن نہیں کہ ایسا جی کو بھی دھوکہ دے انہوں نے آگے چل کر اپنے خط میں لکھا کہ حیدر علی راجہ کے وفاداروں میں سے ہیں حیدر علی کے بارے میں جو بدگمانی ہے وہ دل سے نکال دیں۔ نندراج کا خط ملتے ہی اس کے ارادے بدل گئے حیدر علی کو خط لکھ کر بتایا کہ بنگلور کی جنگ اور میسور کی رہائش پر جو خرچ آیا ہے وہ مل جائے تو وہ واپس چلا جائے گا۔ حیدر علی نے دانشمندی اسی میں سمجھی کہ مرہٹوں کو صرف خرچ دے کر روانہ کرنا مناسب نہیں بلکہ ان کو دور رکھنے کے لئے کچھ جاگیر بھی دے دی جائے تا کہ وہ فوراً سری رنگا پٹن چھوڑ کر چلے جائیں انہوں نے جنگ کے خرچ کے علاوہ بارہ محل کا علاقہ بھی دے کر معاہدہ کر لیا اور مرہٹے رانیوں اور راجہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر بارہ محل پر قبضہ کرنے کیلئے نکل پڑے سری رنگا پٹن بے یار و مددگار ہو گیا۔ سری رنگا پٹن مرہٹوں سے خالی ہونے کے بعد کھنڈے راؤ اور راجہ اور رانیوں کی حالت ابتر تھی لیکن شاطر رانیوں نے حیدر علی کو اب نشانہ بناتے ہوئے ایک خط لکھا کہ ریاست کی ترقی اور خوشحالی کے لئے امن بہترین انتظام ضروری ہے جس کا فقدان ہے ریاست کبھی بھی ہاتھ سے نکل سکتی ہے، لہذا آپ سری رنگا پٹن تشریف لائیں اور اقتدار سنبھالیں، ۔ حیدر علی رانیوں کی چال اچھی طرح سمجھتے

تھے انہوں نے ایسی شاطر چال چلی کہ کام بھی بن جائے اور بدنامی بھی نہ ہو۔ سید مخدوم کی مدد سے سری رنگا پٹن پر چڑھائی کردی۔ محل پر گولہ باری جاری رہی تا کہ کھنڈے راؤ کو گرفتار کیا جا سکے۔ کھنڈے راؤ غدار رانیوں کی مدد بہت کر چکا تھا اسی لئے پیغام بھیجا کہ کھنڈے راؤ کی جان بخشی کی جائے۔ حیدر علی نے یہ بات مان لی کھنڈے راؤ کو حیدر علی کے حوالے کر دیا۔ حیدر علی نے اسے لوہے کے پنجرے میں قید کر دیا۔ جہاں بھی جاتے پنجرا ساتھ لے جاتے۔ کھنڈے راؤ اپنی موت تک اسی میں بند رہا۔ سری رنگا پٹن کو فتح کرنے کے بعد اگر حیدر علی چاہتے تو سارا محل ڈھا دیتے راجہ کا قتل بھی کر سکتے۔ رانیوں کو قید کر کے لونڈیوں اور باندیوں جیسا سلوک کر سکتے تھے لیکن حیدر علی نے ایسا نہیں کیا کیوں کہ میسور کی حکومت سے انہیں رغبت تھی الٹا انہوں نے راجہ کی خدمت میں تحفے تحائف اور نذرانے روانہ کئے دربار میں باریابی کی اجازت چاہی۔ یہ حیدر کا اخلاق اور میسور کے راجہ کے لئے ادب تھا۔ ورنہ وہ جنوبی ہندوستان کے نواب تھے۔ ان کو کیا ضروری تھا کہ سری رنگا پٹن کی چھوٹی سی حکومت جو شہر سری رنگا پٹن کے محل کے اطراف کے چند دیہاتوں تک محدود تھی باریابی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی بلکہ راجہ کو ان کے شایان شان استقبال کے لئے حاضر ہونا چاہئے تھا لیکن نہیں حیدر علی نے اپنا فرض ادا کیا۔ حیدر علی اپنے خاص مشیروں سرداروں اور سپاہیوں کے ساتھ راجہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ایک خاص ملاقات میں یہ فیصلہ ہوا کہ برائے نام سری رنگا پٹن کی ریاست حیدر علی کے حوالے کی جائے۔ اس کے بدلے راجہ اور اس کے ساتھیوں کو کچھ جاگیر صرفے کے لئے دیا جائے حیدر علی نے راجہ اور رانیوں کے علاوہ اس کے ساتھیوں کی جان بخشی کی اور تین لاکھ روپیوں کی جاگیر عطا کی۔ ساتھ میں یہ وعدہ بھی کیا کہ ان کا وقار اسی طرح باقی رکھا جائے گا جس طرح اس حالت کو پہنچنے سے پہلے تھا۔ حیدر علی نے اپنی زندگی تک وعدہ نبھایا دسہرہ کی جمبو سواری محل کی تجلی وغیرہ جو آج بھی جاری ہے رہنے دیا اور سلطان کو بھی وصیت کی کہ دسہرے کے موقع پر خود راجہ کے تحف تحائف لے جاتے رہیں راجہ کے وقار کو دھکا لگنے نہ دیں جس پر سلطان نے اپنی شہادت تک بر بر عمل کیا۔

نواب حیدر علی خان بہادر غاصب نہیں تھے

مشہور ہندو مصنفہ سبیتا دیوی (Sabita Devi) اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں

''حیدر علی پر سب سے پہلا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ہندو راجہ سے غداری کر کے اس کا ملک چھین لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا، لیکن اگر تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ الزام بالکل غلط نظر آئے گا حیدر علی کے عروج سے پہلے میسور ایک بہت ہی معمولی ریاست تھی، جس میں صرف ۳۳ گاؤں تھے یہاں کے راجہ پہلے بیجاپور کے مسلمان بادشاہوں کے باجگذار تھے۔ اس کے بعد 1687 میں شہنشاہ اورنگ زیب کے باجگذار ہو گئے۔ چند سال بعد اورنگ زیب نے میسور کے راجہ چک راج وڈیر کو جگ دیو کا خطاب دے کر نوبت اور نقارہ رکھنے کی اجازت دی۔ میسور کی جاگیر سرا کے مغل گورنر کے ماتحت تھی۔ حیدر علی راجہ میسور کی ملازمت میں سپہ سالاری کے عہدے تک پہنچا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد مغل شہنشاہ ہند نے حیدر علی کو سرا کا گورنر مقرر کر دیا اور اسے شاہنانہ مراتب اور نقارہ وار نشان معہ خطاب نوابی دربار مغلیہ سے عطا ہوا۔ اس طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حیدر علی اب راجہ میسور کے ماتحت نہ رہا تھا بلکہ راجہ میسور اس کے ماتحت تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے راجہ کی ہمیشہ عزت کی، باوجود اس کے کہ راجہ میسور 33 گاؤں کا مالک تھا اور حیدر کے زیر نگیں 80,000 (اسّی ہزار) مربع میل ملک تھا لیکن وہ راجہ میسور کو اپنا آقا سمجھتا تھا اور اس کی ہر ممکن خدمت کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتا تھا۔ اس نے کئی بار میسور کو تباہی سے بچایا لیکن جب راجہ غدّار وزیروں نے راجہ بالکل مفلوج کر دیا اور حیدر علی کے خلاف سازش کرنے لگے تو اس نے مجبور ہو جاگیر میسور کی لگام خود اپنے ہاتھ میں لی اور راجہ کو ایک باجگذار والی ریاست کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں رکھا۔ حیدر علی کے لئے آسان تھا کہ وہ اس طرح جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے ارکاٹ اودھ، ناگپور اور ستارہ کے شاہی خاندانوں کو بے نشان کر دیا، میسور کے شاہی خاندان کو جلا وطن کر دیتا۔ لیکن نہیں حیدر علی نے راجہ میسور کے اعزاز و مناصب بدستور قائم رکھا۔ دسہرہ کے موقع پر جو دربار ہوتا تھا اس میں حیدر علی اور اس کے لڑکے ٹیپو سلطان کی جانب سے راجہ کی خدمت میں نذریں پیش کی جاتیں تھیں۔ کیا اس کے بعد بھی حیدر علی کو غدار اور نمک حرام کہا جا سکتا ہے؟'' (سلطنت خداداد۔ ص ۶۸ تا ۷۰)

اس کے علاوہ تاریخ رولرس آف انڈیا (Rulers of India) کا مصنف ڈی

اسول (D.Oswal) نے ص ۱۶۴ پر لکھا ہے کہ حیدر علی کے سامنے اس وقت اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ (تاریخ میسورس۔ خ۔۱۲۲)

ایک اور کتاب ہسٹری آف انڈیا (History of India) کا مصنف تھامسن (Thomson) ص ۲۶۹ پر لکھتا ہے کہ حیدر کا یہ قدم بالکل حق بہ جانب تھا کہ اس نے میسور کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا ورنہ راجہ اور سازش کرتا جس سے حیدر علی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ۔ (تاریخ میسورس۔ خ۔ص ۱۲۳)

ہسٹری آف حیدر (History of Hyder) کا مصنف بؤرنگ (Bowring) اپنی تاریخ میں اعتراف کرتا ہے کہ ''اگر کھنڈے راؤ جو حیدر علی کی خاص عنایت سے وزیر بنادیا گیا تھا، حیدر علی سے غداری نہ کرتا اور راجہ اور اس کی رانیوں کو نہ اکساتا تو حیدر علی پر جان لیوا حملہ نہیں ہوسکتا تھا۔ حیدر علی کو بہت ستایا تھا، بہت تکلیف دی تھ اور اس وجہ حیدر علی نے مجبور ہوکر میسور کے اقتدار کو اپنے ہاتھ می لے لیا تھا۔'' پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ ''جب حیدر علی کو حکومت مغلیہ کی طرف سے سرا کا نظام اور ہیڈ آف سٹیٹ کا اختیار دے دیا تھا تو خود بخود ریاست میسور سرا کے زیر انتظام آگئی تھی اور سرا کی حکومت کی ریاست میسور باجگذار بھی تھی۔'' تاریخ میسورس۔ خ۔۱۲۳۔۱۲۴)

ان تاریخی حقائق کے پیش نظر حیدر علی کو غاصب کہا جا سکتا ہے؟ ہم اپنے ہی ہم وطنوں کو غدار اور متعصب کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ بنیادی اور ثانوی تعلیم میں جو تاریخ لازمی طور پر پڑھائی جارہی ہے ان کتابوں میں تاریخ کو توڑ مڑوڑ کر ایسا مواد بھر دیا گیا ہے۔ ہم اس بات کو اہمیت نہیں دیتے کہ ان کلاسوں میں جو بات ذہن میں بٹھادی جاتی ہے ساری عمر بچہ اسکو صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی حیدر علی، ٹیپو سلطان اور اونگ زیب وغیرہ بادشاہوں کے بارے میں کئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں ہیں جو انہیں متعصب ذہنوں کی پیداور ہے۔

صاحب موصوف ٹیپو سلطان کی حکومت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ ''۱۷۹۹ء میں میر صادق اور میر جعفر نامی بد بخت غداروں کی شرمناک سازشوں کے نتیجہ حضرت ٹیپو سلطان شہید کردئے گئے''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطنت خداداد غداروں کے باعث زوال پذیر ہوئی جن میں بہت

سے نام گنائے جاسکتے ہیں ان میں خصوصاً میر صادق کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ نے انہیں غداروں کے متعلق جاوید نامہ میں ذکر کیا ہے ؎

ننگ ملت ننگ دیں ننگ وطن جعفر از بنگال صادق از دکن

بنگال کے بادشاہ اور اس کی سلطنت کو میر جعفر نے ختم کیا تھا اور میر صادق نے ٹیپو کی سلطنت اور خود ٹیپو سلطان کی شہادت کا باعث بنا۔

ایک ماہر سیاست دان کا مقولہ ہے کہ ''اگر سراج الدولہ کی سلطنت لینی ہو تو میر جعفر کو پیدا کرو، اگر ٹیپو سلطان سے لڑنا ہے تو پورنیا و میر صادق کو روٹی اپنے ہاتھ میں رکھو پھر دیکھو کہ ہندوستان کی قومیں آپس میں لڑتے ہوئے کس طرح تمہارے غلام بنے ہوئے رہتے ہیں''۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مقولہ پر پورا پورا عمل کیا میر جعفر، پورنیا اور میر صادق خوش قسمتی سے پیدا ہوئے۔ حیدر علی نے ایک آزاد سلطنت قائم کی، بیٹے نے شجاعت بہادری، نگاہ دوررس اور اولوالعزمی سے تمام ہندوستان کو آزاد بنانا چاہا۔ وہ حق وصداقت آزادی وشجاعت کا بے مثل نمونہ بن کر آئے کہ مسلمان اور ہندوستان اس سے سبق سیکھیں'' (س۔خ۔ص ۶۱۳) اقوام ہند میں باہمی نفاق تھا جس کے باعث ہندوستان انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا۔

ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ
مورخہ ۷/نومبر ۲۰۱۳
سابق پرنسپال گورنمنٹ ڈگری کالج
بنگلور

حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے ایجادات واختراعات

سلطنت خداداد کا مختصر دور (1799-1761ء) تاریخ میسور کا سنہرا دور تھا۔ نواب حیدر علی نے زندگی کے کٹھن مراحل طے کرنے کے بعد 1761 میسور کی عنان حکومت ہاتھ آئی۔ 1750ء میں فتح علی ٹیپو کی ولادت کے ساتھ ہی حیدر علی کا ستارۂ اقبال بھی بلند ہوا اور میسور کی وسیع سلطنت کے نواب بنے۔ نواب حیدر علی کو نا مساعد حالات کے باعث امی ہی رہنا پڑا۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اپنی وسیع سلطنت کے وارث کو امی نہیں بلکہ ایک تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے جس کے لئے بچپن ہی میں اس کا بندوبست کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانی کے دور میں ہی شہزادہ ٹیپو سلطان فوجی مہارت کے ساتھ ساتھ کسی بھی علمی موضوع اور فن پر جیسے سائنس، میڈسین (طب)، انجینئرنگ، علم نجوم اور موسیقی کھل کر بحث کرنے لگے۔ ان کا شمار تعلیم یافتہ طبقہ میں ہونے لگا۔

اگر چہ کہ سلطنت خداداد کی سرکاری زبان فارسی تھی لیکن ساتھ ہی ٹیپو سلطان کو دیگر زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ علاقائی غیر اقوام کے لئے کنڑا، پڑوسی ریاستوں کے لئے مرہٹی تیلگو کا استعمال کرتے تھے، اور غیر ممالک کے وفود سے بات چیت وحکومت کے معاملات کو طے کرنے کے لئے فرانسیسی، عربی اور انگریزی زبان سے بھی واقفیت تھی۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ غیر معمولی ذہین تھے اور قدرت نے انہیں ذہانت کے ساتھ ساتھ اختراعی ذہن بھی عطا کیا تھا جس سے سلطان کے اندر غیر معمولی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر

ہوئیں۔اسی کا نتیجہ تھا کہ سلطان ہمیشہ نئی نئی ایجادات اور اختراعات کے بارے میں سوچا کرتے۔

ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انہوں نے پوری سلطنت میں آبادی کی مردم شماری (Census) جس میں اجناس اور سامان بھی شامل کروایا۔اور اس کے مکلّف قاضی تھے۔

آپ نے اپنی سلطنت جمہوری طرز پر قائم کی۔جس کی مثال پنچایت راج ہے۔ٹیپو سلطان نے باقاعدہ فرمان جاری کر کے اس کو سرکاری حیثیت دی گاؤں کے پٹیل کو سربراہ مقرر کیا اور اس کے تعاون کے لئے شان بھوگ (محاسب) رکھا گیا پنچایت کے ارکان کا انتخاب خود عوام کرتے۔ضلعی سطح پر قائم کمیٹی میں اپنے گاؤں کے نمائندے کو چن کر بھیجا جاتا تھا جو اپنے گاؤں کی نمائندگی کرتا۔پنچایتی نظام عوام کے نمائندوں کو سرکاری امور میں شامل کرنے کے لئے سلطان کے ذہن کی اختراع تھی۔

دفاعی ضروریات کے لئے ایسی (BULLET PROOF) بکتر بند گاڑیاں تیار کرائیں جس پر گولیوں کا اثر نہیں ہوتا تھا۔انہیں کے حکم سے فرانسیسی ماہرین نے پانی سے چلنے والا ایک ایسا انجن تیار کیا جس سے توپوں میں با آسانی سوراخ کیا جا سکتا تھا۔

بحری جہازوں کی تاریخ میں سمندر میں جہازوں کو مقناطیسی پہاڑوں کے خطرے سے بچانے کے لئے لوہے کی جگہ تانبے کا استعمال کیا گیا۔

دنیا میں میزائیل ایجاد کرنے کا سہرا بھی سلطنت خداداد کے سر ہے۔یہ ایجاد محکمۂ دفاع اور سائنس کے لئے آپ کا بہت بڑا عطیہ ہے۔ Gennis History of Land

war field میں داخل شدہ ریکارڈ کے مطابق دنیا کی سب سے پہلی راکٹ نواب حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف 1780ء میں استعمال کیا۔حیدر علی کی ایجاد کردہ راکٹ 1.4 کیلومیٹر تک حملہ کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ان راکٹوں کا کارخانہ بنگلور سے قریب دیون ہلی کے نزدیک تھا جس کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ٹیپو سلطان کے دور میں اس میں کچھ اور اضافہ کیا گیا جس کے باعث یہ راکٹ ڈھائی کیلومیٹر تک مار کر سکتے تھے۔ ان کا استعمال میسور کی جنگوں میں ہونے کے 37 برس بعد تک بھی انگریزوں کو اس تیکنالوجی کا علم نہ ہوسکا۔1799ء زوال سلطنت خداداد کے بعد ولیم کانگریو نے اس تیکنالوجی اور اس سے قبل کے فلسفہ کو میسور سے چرالے گیا اور انگلینڈ جا کر اس میں کچھ تبدیلیاں کرلیں 1805ء میں راکٹیں بنائیں اور 1806ء میں باولون کے بحری حملہ میں اس کا استعمال کیا۔اس کے سوا کوئی نئی ایجاد و اختراع اس نے نہیں کی۔

امریکیوں نے بھی انہیں راکٹ کے بانیوں میں شمار کیا ہے۔ہندوستان کے موجودہ راشٹر پتی، بابائے میزائیل، بھارت رتن، اے۔پی۔جے عبدالکلام میزائیل کے کام کے لئے NASA امریکہ گئے تھے۔تو وہاں انہوں نے ایک فوٹو فریم کیا ہوا دیکھا جس میں راکٹوں کو اڑایا جارہا ہے اور سپاہی ہندوستانی لباس میں ملبوس ہیں۔انہوں نے وہاں کے عہدیداروں سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے آپ پر اس بات کا انکشاف کیا کہ یہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سپاہی ہیں جو راکٹوں کا استعمال کررہے ہیں۔جس کا ذکر آپ نے اپنے سوانح حیات میں کیا ہے اور اخباری بیان بھی دیا تھا۔

ٹیپو سلطان جب بھی اپنی سلطنت کے کسی کارخانہ میں ملاحظہ کے لئے جاتے تو کسی نئے

طرز یا جدید انداز کی کوئی چیز بنانے کا حکم ضرور دیا کرتے۔شال،مخمل،کمخواب وغیرہ میں نئی اختراعوں کی تعلیم ضرور ہوا کرتی۔

ٹیپو سلطان کو شیر اپنی طبعی شجاعت و بہادری اور آزادی کے لحاظ سے بہت پسند تھا اور ان کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن چکا تھا۔اس طرح دیکھا جائے تو ٹیپو سلطان اور شیر دونوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔وہ شیر کی طرح آزادی کی زندگی پسند کرتے تھے۔ان کا آخری جملہ ''گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی مجھے عزیز ہے۔'' سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔جب تک آپ زندہ رہے شیر کی زندگی جیتے رہے۔محلات قلعوں وغیرہ کی تعمیر کے وقت شیر ببر کی کھال کی دھاریوں میں بنائی جاتیں۔ مسجد اعلیٰ کی دیواروں پر ببری رنگ چڑھایا گیا تھا۔ملیبار کے نائر جب مسلمان ہو گئے تو ان کی خواہش کے مطابق ان سب کو اپنی فوج میں شامل کر کے ایک علحدہ دستہ جماعت احمدی کے نام سے بنایا گیا دوسروں سے امتیاز کے لئے شیر ببر کی کھال سے بنی وردی مقرر کر دی۔بعض توپیں بھی شیر نما بنوائی گئیں تھیں۔ببری کپڑا ٹیپو سلطان کی خاص ایجاد ہے۔ اکثر وہ اسی کی قبا پہنا کرتے۔اپنے تمام ہتیاروں پر اسداللہ (شیر خدا) کندہ کروایا کرتے۔

شاہی محل میں بھی پنجروں میں شیروں اور چیتوں کی ایک بڑی تعداد ہوا کرتی۔زوال سلطنت کے بعد جب محل کی لوٹ ہوئی جس کا جملہ اندازہ نو کڑوڑ روپئے تھا۔مال غنیمت کی تقسیم میں حیدرآباد کے میر عالم کو صرف ایک لاکھ پگوڈا دئے گئے تو میر عالم نے ویلزلی سے شکایت کی اس نے کہا کہ اس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا ہے اگر وہ چاہے تو سلطانی محل میں موجود شیروں کو مال غنیمت کے طور پر لے سکتا ہے جب میر عالم نے اس کو لینے سے

انکار کیا، تو ان خونخوار شیروں اور چیتوں کو انگریز سپاہیوں نے گولیوں سے اڑا دیا البتہ تین چیتے برطانیہ کے شاہ جارج سوم کو تحفتاً بھیجے گئے۔

خلیفہ روم سے اپنی حکمرانی کی توثیق کے بعد اپنے لئے ایک خوبصورت و نیا شاہی تخت بنوایا جو شیر کی شکل کا تھا۔ زوال سلطنت کے بعد سب سے قیمتی اور قابل دید چیز انگریزوں کے لئے یہی تھی جو سلطان نے کاریگروں سے اپنی ذاتی نگرانی میں بنوایا تھا۔ یہ تخت شیر کی شکل کا تھا آٹھ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا، اس تخت کو لکڑی سے بنے چار شیروں کی پشت پر بنایا گیا جس پر سونے کی چادر چڑھی ہوئی تھی اس کے دونوں جانب چاندی کے چھوٹے چھوٹے زینے تھے۔ اس کی چھتری پر سنہرے تاروں میں پروئی ہوئی موتیوں کی جھالر اور سب سے اوپر سونے سے بنا ہما کی شکل کا پرندہ تھا تخت کے چاروں طرف قیمتی ہیرے جواہرات سے جڑے دس چھوٹے چھوٹے شیر تھے دور سے دیکھنے پر یہ تخت شیر نما معلوم ہوتا تھا۔ جب سلطان اس تخت پر جلوہ افروز ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ کبوتر کے برابر یہ چھوٹا سا ہما پرندہ ان کے سر پر سایہ فگن ہے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے سونے کے دو شیر نکال کر بادشاہ کو لندن رونہ کر دیا اس کے بعد اسکے حصے بخرے کر کے اعلیٰ فوجی افسران میں تقسیم کر دیا گیا جس کی مالیت ہر ایک کے حصہ میں ایک ہزار آٹھ سو پونڈ تھی۔

آغاز جوانی میں جنگلوں میں چیتوں کے ذریعہ سے شکار کیا کرتے۔ جنگل میں شکار کے وقت ایک خونخوار شیر کا سامنا کرنا پڑا تو اپنی غیر معمولی جراءت سے وہیں ختم کیا تھا۔ شیر کی اسی مناسبت سے انگریزوں نے TIGER OF MYSORE کا خطاب دیا اور اسی نام سے ساری دنیا میں شہرت پائی۔

ٹیپو سلطان ایک بہت اچھے خطاط تھے اپنی ذہانت سے خط محمدی کے نام سے ببری خط ایجاد کیا تھا جس میں تحریر شیر ببر کی دھاریوں کی طرح ہوتی تھی۔اور اس کے لئے ایک مستقل رسالہ بھی لکھوایا۔

ٹیپو سلطان نے شیر کی صورت کا ایک باجا بھی بنوایا تھا جس کے اندر سے چیتے کے غرانے کی آواز نکلتی تھی۔اس باجے میں وہ شیر ایک بے بس انگریز کو دبوچے ہوئے تھا۔ زوال شرنگا پٹن کے بعد اس کو دیگر آثار کے ساتھ لندن بھیج دیا گیا وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔ٹیپو سلطان نے اپنی سلطنت کا انوکھا نام رکھا اور اس کو سلطنت خداداد سے موسوم کیا۔

جدت طبع کا یہ عالم تھا کہ سلطان اپنی تحریروں میں نہ خالص سیاہی استعمال ہوتی تھی اور نہ سرخی، بلکہ دونوں کو مخلوط کر کے لکھا کرتے۔

مفرح القلوب (مفتاح القلوب) ۱۷۸۵ء از حسن علی عزت

فارسی زبان میں ٹیپو سلطان نے فن موسیقی پر اپنی نگرانی میں املا کروائے جس میں چھ ابواب ہیں۔یہ کتاب علمی، فنی اور ادبی شاہکار کے ساتھ ساتھ سلطنت خداداد کا گراں قدر سرمایہ ہے۔جس میں سلطان کے اختراعی صلاحیت اور ذاتی رجحان، دربار سلطانی کی علمی وادبی فضا اس کتاب میں نظر آتی ہے۔فن موسیقی میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب نورس کے بعد یہ کتاب بیش بہا اضافہ قرار پاتی ہے

اردو کا پہلا اخبار

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے مولوی محمد باقر نے ۱۸۵۷ء میں جاری کیا۔ ار جولائی ۱۹۵۷ء ہماری زبان علی گڈھ میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ ٹیپو سلطان ہی اردو اخبار کے بانی تھے۔ ۱۷۹۴ء میسور کی تیسری جنگ کے بعد اپنی سلطنت کی از سر نو تنظیم کے دوران سرکاری حکم نامہ جاری کیا گیا کہ ایسا مطبع جاری کیا جائے جو عربی رسم الخط میں چھپائی کا کام انجام دے سکے۔ مطبع قائم ہونے کے بعد اسی سال وہاں سے اردو میں سلطان کی نگرانی اور سرپرستی میں جاری ہوا۔ ہفت روزہ ''فوجی اخبار'' بڑی تقطیع پر شائع ہوا۔ یہ اخبار سپاہیوں کی خاطر تھا جو سلطان کی شہادت تک جاری رہا۔ زوال سری رنگا پٹن کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی فائلوں کو چن چن کر جمع کرتے اور آگ لگاتے رہے۔

پیمائش اور ناپ تول کے لئے نئے پیمانے ایجاد کئے۔ ساحلی صوبوں کو 'یم' اور میدانی صوبوں کو 'صوبجات عنبرا' کا نام دیا۔ بارہ پونڈ تک وزنی راکٹ کا نام 'شہاب' توپ کو درخش، بندوق کو تفنگ، سہ ضربہ بندوق کو مقراض کا نام دیا گیا۔ سلطان نے اپنے ذاتی گھوڑے کا نام 'طاؤس' رکھا تھا۔ سزاؤں میں بھی اختراع کیا معمولی جرم کی سزا ایک درخت اگانا تھا اور سنگین جرم کے لئے کئی درخت فصل آنے تک اگانے تھے۔ سلطان نے جیش کا نام بدل کر ''عسکر'' رکھا۔ اسی لحاظ سے بنگلور کنٹونمنٹ کو معسکر کہا جاتا ہے۔

سلطنت خداداد میں سونے، چاندی اور تانبے تین قسم کے سکے رائج تھے۔ اس کو ڈھالنے کے لئے پوری سلطنت میں بارہ ٹکسال سری رنگا پٹن کے علاوہ میسور، بنگلور، بدنور اور کالی کٹ وغیرہ میں قائم تھے۔ ٹیپو سلطان کی حکومت ابتدائی چار سالوں تک سکوں

پر ہجری کی تاریخیں کندہ ہوتیں بعد میں اس کی جگہ مولودی سنہ نے لے لی۔ سونے چاندی کے سکوں پر عام طور پر ایک جانب السلطان العادل الوحید اور دوسری جانب دین احمد در جہاں روشن از فتح حیدر است لکھا ہوتا۔

۱۴ روپئے کے برابر قیمت والی اشرفی کو حضورؐ کے نام کی نسبت سے احمدی، ۷ روپئے کے برابر کی اشرفی کو صدیقی، ساڑھے تین روپے کے برابر اشرفی کو فاروقی، اور سب سے چھوٹی اشرفی کو راحتی کا نام دیا گیا تھا۔ ۲ روپے کے برابر چاندی کے سکہ کو حضرت علی کی نسبت سے حیدری اور بقیہ سکوں کو بارہ اماموں کے نام پر باقری جعفری وغیرہ کہا جاتا۔ ۱/ روپے کے برابر والے سکہ کو امامی، اٹھنی کو عابدی، چونی کو باقری دو آنے کے برابر سکہ کو جعفری اور ایک آنہ کے برابر سکے کو کاظمی ۳ پیسے کے برابر سکے کو خضری کہا جاتا۔ تانبے کے سکے کو جو حضرت عثمان کی نسبت سے عثمانی کہا جاتا لیکن بعد میں اس کا نام بدل کر مشتری رکھا گیا۔ آنہ کا نام آیہ رکھا۔

ملک میں تجارتی کمپنی قائم کی جس میں سلطنت کا کوئی بھی باشندہ کم از کم پانچ روپیے اور زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپیہ لگا کر سال کے آخر میں ۵۰٪ منافع کا حقدار بن سکتا تھا۔ ۵۰۰ اور ۵۰۰ سے زیادہ تک کے روپئے لگانے والوں کو ۲۵٪ منافع ملتا۔ یہ پیسہ تجارت کے لئے لگایا جاتا۔ مالداروں کے بجائے غریبوں کو اس میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ چند ہی دنوں میں سلطنت میں ہی ۳۰ سے زیادہ کوٹھیاں قائم تھیں۔ تجارت کے فروغ کیلئے بیرون ممالک میں بھی کئی کوٹھیاں قائم کی گئیں تھیں جیسے عدن، جدہ بصرہ، مسقط، شہرار مزو غیرہ۔

باہر کے ممالک سے ریشمی کیڑے منگوا کر ریاست کرناٹک میں ریشم کو فروغ دینے

والے ٹیپو سلطان ہی تھے اس کے لئے پوری مملکت میں بارہ مراکز قائم تھے۔ ۳۱۸ کنبے ریشم کی کاشت میں مصرف تھے۔ آج ہماری ریاست میں پندرہ لاکھ دیہاتی عوام ریشم کی کاشت سے خوشحال اور متمول زندگی گذار رہے ہیں۔

ٹیپو سلطان سے قبل ملک میں مغلیہ زمانے سے سـہ ھ کا رواج چلا آتا تھا اس میں نقص یہ تھا کہ لگان کی وصولی میں بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں اس لئے کہ لگان فصلوں کی تیاری کے بعد ہی لیا جاتا تھا۔ سنہ ہجری کے مہینے آگے پیچھے ہو جاتے۔ اس نقص کو محسوس کرتے ہوئے سلطان نے ایک نئی تقویم جاری کی جس کی وجہ سے ہر مہینہ ٹھیک اسی موسم میں آتا جیسے اگلے موسم میں تھا۔ تقویم بنانے کے بعد مہینوں کے نام ابجد وابثت کے حساب پر رکھا اس سے سلطان کی مراد یہ تھی کہ حروف تہجی کی ترتیب یا ابجد کے حساب پر نام رکھے جائیں کو لوگوں کو یاد رکھنے میں آسانی ہو گی۔ اور سنہ مولودی کا آغاز کیا جس کی ابتداء ہجرت نبوی کے بجائے بعثت نبوی سے ہوتی تھی۔

مہینوں کے نام

بحساب ابجد	بحساب اثبت
۱) احمدی	۱) احمدی
۲) بہاری	۲) بہاری
۳) جعفری	۳) تقی
۴) دارائی	۴) ثمری
۵) ہاشمی	۵) جعفری
۶) واسعی	۶) حیدری

۷)زبرجدی	۷)خسروی
۸)حیدری	۸)دینی
۹)طلوعی	۹)ذکری
۱۰)یوسفی	۱۰)رحمانی
۱۱)یازدی	۱۱)راضی
۱۲)بیاسی	۱۲)ربانی

پنجانگ (ہندوؤں کی تقویم) کے حساب سے ساٹھ سال کا ایک جگ ہوتا ہے۔اس لئے ان ساٹھ سالوں کو بھی مذکورہ بالا طریقہ سے نام دئے گئے تھے مثلاً احد،احمد،اب،ابا، باب،تاب،تابا،باج،تاج، وغیرہ۔ ہندسوں کو دائیں جانب سے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا مثلاً 2000ء۔اس کو اس طرح لکھا جاتا 0002ء سرکاری محکموں کے نام اسماء الحسنٰی کے نام پر رکھے گئے تھے مثلاً رزاق کچہری Dept of Food and Civil Supplies غفار کچہری وغیرہ۔اسی لحاظ سے اٹھارہ اہم محکمہ جات کو اٹھارہ کچہری کا نام دیا گیا تھا جو پہلے تو بنگلور کے سلطانی محل میں قائم تھا،انگریزوں کے دور میں ایک نئی عمارت تعمیر ہوئی جواب ہائی کورٹ ہے۔ یہ محکمے وہاں تبدیل ہوئے اور نئی عمارت ودھان سودھا اور وکاس سودھا میں منتقل ہوگئے ہیں۔

شہروں کے نام

ٹیپو سلطان کے شوق اختراع نے جہاں سلطنت کا نام بدل کر سلطنت خداداد رکھا، وہیں

اپنی سلطنت کے مختلف شہروں اور قلعوں کے نام بھی بدل دئے۔

پرانا نام	نیا نام
۱۔بنگلور	دارالسرور
۲۔بلاری	ثمر پٹن
۳۔کالی کٹ	اسلام آباد
۴۔کوئمبتور	سلام آباد
۵۔کولار	عظیم آباد
۶۔سرا	رستم آباد
۷۔ملولی	گلشن آباد
۸۔میسور	نظر آباد
۹۔دیون ہلی	یوسف آباد
۱۰۔منگلور	جمال آباد
۱۱۔دھارواڑ	خورشید سواد
۱۲۔ہوسکوٹہ	اسلام پور
۱۳۔سری رنگا پٹن	ظفر آباد
۱۴۔ڈینڈیگل	خالق آباد
۱۵۔فیروک	فرخی

۱۶۔بھٹکل	رحمت آباد
۱۷۔پاؤگڈھ	ختمی/حافظ آباد
۱۸۔قلعہ چتلدرگ	فرحیاب حصار
۱۹۔نندی گڑھ	گردوں شکوہ
۲۰۔قلعہ سکلیشپور	منظر آباد
۲۱۔کشن گری	فلک الاعظم
۲۲۔پنگونڈہ	فخر آباد
۲۳۔قلعہ گتی	فیض حصار
۲۴۔بدنور	حیدر نگر
۲۵۔ماگڑی درگ	ساونگڑھ (فلک شکوہ)
۲۶۔کورگ	ظفر آباد
۲۷۔سنگلی درگ	مظفر آباد
۲۸۔پال ہلی	رحمت نگر
۲۹۔رتنا گیری	مصطفےٰ آباد
۳۰۔ہاسن	قائم آباد
۳۱۔کپل درگ	جعفر آباد
۳۲۔امبارانی درگ	ازبر آباد
۳۳۔ہلیار درگ	وفور آباد

۳۴۔کرم گیری	محی الدین آباد
۳۵۔دیورائے درگ	بالاشکوہ
۳۶۔گڑی بنڈہ	عظمت شکوہ
۳۷۔چمبارگڑھ	رضا آباد
۳۸۔ببرن درگ	عظیم آباد
۳۹۔مرکال مڑو	محمود آباد
۴۰۔کن کپا	ممتاز گڑھ
۴۱۔کنداپور	نصیر آباد
۴۲۔کبی درگ	امتیاز گڈھ
۴۳۔چندرگتی	شکور آباد
۴۴۔سبکوجی	واسط آباد
۴۵۔سداشیوگڑھ	مجید آباد
۴۶۔دھنیان کوٹہ	حسین آباد
۴۷۔آنند پور	احمد آباد
۴۸۔چکرگیری	عزیز آباد
۴۹۔مرگس	رحمٰن آباد
۵۰۔ساحل سمندر کا علاقہ	صوبہ 'یم'
۵۱۔صحرائی وکوہستانی علاقہ	صوبہ ترن

۵۲۔میدانی علاقہ صوبہ عنبرا۔

یہ مضمون جامعہ بنگلور کے درسی کتاب نوشتۂ ادب برائے بی۔یس۔سی فورتھ سمسٹر میں شامل رہا۔

نام کتاب :۔اسلام کے دشمن، ملک کے غدار

دین دار چن بسویشور

مصنف :۔منیر احمد ٹمکوری

صفحات :۔۱۴۸

قیمت :۔۳۰ روپئے

پتہ :۔اسلامک پروپیگیشن سنٹر

غوث بلڈنگ ھور پیٹ مین روڈ ٹمکور۔۱

تبصرہ نگار :۔ڈاکٹر محمد صبغۃ اللہ

بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

معرکۂ حق و باطل ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔تاریخ گواہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا اس کی برتری قائم رکھی اور باطل اپنی لاکھ کوشش کے باوجود ہمیشہ ذلیل ورسوا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔دین اسلام کا نزول تمام ادیان کے خاتمہ کا اعلان کرتا ہے اور نبی آخرالزماں پر آسمانی وحی اور کتب سماوی کے اختتام کا اعلان بھی کرتا ہے۔تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کے دور سے آج تک جب سے اسلام کا ظہور ہوا اس کی دشمنی بھی عام رہی، کیا کفار مکہ، کیا عیسائی کیا یہودی ہر ایک نے اس کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔اور اس کو نیست و نابود کرنے کی ٹھانی۔آپ ﷺ نے دین اسلام کی بقا، اس کی اشاعت و ترویج کے لئے جہاں بہت سے اقدامات کئے وہیں غزوات میں بھی حصہ لیا۔آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین خصوصاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں بہت سے فتنے کھڑے ہوئے جن کی بنیاد جھوٹے نبی اور مرتدین تھے۔حضرت صدیقؓ نے ان سب کا صفایا کیا اور پھر مذہب اسلام کو پھیلانے کا راستہ صاف ہوا۔یہ تقریباً ۱۴۰۰ سال پہلے کی بات تھی۔

لیکن آج کے اس دور میں بھی اسلام دشمنی عروج پر ہے، ہر روز نت نئے فتنے کھڑے ہو رہے ہیں (اور فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے) تاکہ نعوذ باللہ اسلام کی بیخ کنی کی جائے۔اس کے مختلف روپ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔لیکن خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ ہر زمانے میں وہ اس کے تدارک کے لئے کسی نہ کسی مجاہد کو پیدا کرتا رہا جس

نے باطل کے دانت کھٹے کردئے اور فتنہ پرور زمانے میں ذلیل ورسوا ہوکر رہ گئے۔اس صدی میں ایسے ہی فتنے قادیانیوں اور چین بسویشوریوں نے کھڑے کئے ہیں۔اشرف سعودی نے صحیح لکھا ہے کہ ایسے لوگ اسلام کا نقاب ڈال کر، مسلمانوں کی سی صورت بنا کر اور مسلمانوں کے نام رکھ کر جب دام ہم رنگ زمین پر بچھا دیا جائے تو بھولے بھالے اور سیدھے سادے کو پھانس لینا آسان ہے۔

انجمن صدیق دیندار چین بسویشور ایسا ہی خطرناک، غارت گر، تباہ کن، ایمان سوز اور اسلام شگن فتنہ ہے۔اس کے کارکن عام مسلمانوں میں گھل مل کر رہتے ہیں۔دینی خدمات کے نام سے اسلامی معاشرے میں اثر و رسوخ پیدا کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ حرم ایمانی پر اس طرح شب خون مارتے ہیں کہ معصوم مسلمانوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کا ایمانی سرمایہ لٹ چکا ہے اور ان کی زندگی بھر کی محنت ضائع ہوچکی ہے اور وہ باوجود اپنے اسلامی نام اور مسلمانی تہذیب کے دائرہ کفر وارتداد میں پہنچ چکے ہیں'' (دیباچہ ص ۵ کتاب ہٰذا)

چرچوں، مندروں اور مسجد پر حالیہ حملوں اور بم دھماکوں کی چھان بین کرنے والے ڈی یس پی جناب یو نثار احمد کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ اس انجمن کو دہشت گردی کی تربیت پاکستان میں مل رہی ہے ۔پاکستانی افراد اعراس اور دوسرے بہانوں سے یہاں آتے رہتے ہیں۔ضیائ الحسن بن صدیق پاکستان سے یہاں ہر سال آیا کرتا ہے آصف نگر حیدر آباد میں ان کا اڈا جگت گرو آشرم ہے۔ پشاور کے قریب مروان میں، کراچی میں ان کے اڈے ہیں اس فرقہ کی تعلیمات کی بنیاد نفاق ہے مختلف مذاہب کے درمیان نفرت پیدا کرنا اس کا مقصد ہے۔اس نے مسلمانوں میں نفاق پیدا کیا، ہندوؤں میں نفاق پیدا کیا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفاق پیدا کیا۔

حالیہ عبادتگاہوں پر جو حملے ہوئے اسی نفاق کا نتیجہ تھے اسکا مقصد بھارت میں ہندو مسلمان عیسائی فسادات پھیلانا ہے۔اگر ان فسادات کا طویل سلسلہ شروع ہوجاتا تو ملک میں انارکی اور لاقانونیت پھیل جاتی 'پھر پاکستان کی طرف سے دیندار انجمن والوں کے حملے شروع ہوجاتے اور اس طرح چین بسویشور ریاست کا بنانا قرار پایا گیا تھا۔اسی حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ صدیق کو چالیس مرتبہ جیل کے سلاخوں کے پیچھے ڈالا گیا۔ بیڑیاں پہنا کر، منہ کالا کر کے راستوں اور چوراہوں پر گھمایا گیا، جرمانے عاید کئے گئے۔۱۹۴۸ میں نظام سرکار نے اس انجمن پر پابندی عائد کردی۔غرض یہ کہ اس فرقہ کی ابتداء اذیت پسندی، دہشت گردی، قتل و غارت گری سے ہوئی تھی اور آج بھی یہ فرقہ یہی کام انجام دے رہا ہے۔یہ کسی کا دوست نہیں بلکہ ساری انسانیت اور تمام مذاہب کا دشمن

ہے(ص۵۰۔۵۳)

۱۴۸صفحات پر پھیلی یہ کتاب بہت ہی دیدہ زیب سرورق سے آراستہ ہے۔کتاب کی چھپائی اچھی ہےاور کاغذ بھی اچھا استعمال ہوا ہے،اگر اس کی ٹھیک پروف ریڈنگ ہوتی تو اغلاط سے پاک ہوتی،امید کہ اس کوتاہی کو اگلے ایڈیشن میں دور کرلیا جائے گا۔اس کتاب کے سات ابواب میں مصنف نے اس فرقہ کی فتنہ پروری دین وایمان اور شریعت کے خلاف انجمن والوں کی پرفریب چالوں کو حقاحق کی روشنی میں مدلل پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ فرقہ اسلام دشمن ہی نہیں بلکہ ملک دشمن بھی ہے۔۱۵اکتوبر۲۰۰۰ء کے روز نامہ پاسبان کی ایک رپورٹ کے مطابق ٹمکور میں اس فرقہ کے کافرانہ عقائد پر یک روزہ کانفرنس منعقد کی گئی،اہل ٹمکو راس مد میں قابل مبارکباد ہیں کے اس فتنہ کو رد کرنے میں انہوں نے پہل کی۔اسی کانفرنس میں کتاب ہذا اور'فتنہ چن بسویشور'از مولانا خالد بیگ ندوی کا اجراءعمل میں آیا۔اگر ایسی ہی کانفرنسیں'سیمینار،سمپوزیم وغیرہ کا اہتمام ریاست میں پے در پے اور مختلف جگہوں پر ہوتے رہیں تو عوام الناس میں ان کی حقیقت کا پول کھل جائے گا۔مصنف کتاب ہذا نے جراءت رندانہ سے کام لیکر ایک مجاہدانہ قدم اٹھایا ہے جو واقعی قابل تعریف ہے۔ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ قادیانیت اور چن بسویشوریت کے اس فتنہ کو سمجھیں اور اسلام کے ان درپردہ دشمنوں کا خاتمہ کریں۔

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری

فراقؔ کی پیدائش ۲۸ راگست ۱۸۹۶ بارہ بجے دن کو بروز جمعہ گورکھپور شہر میں ہوئی۔ان کے والد جناب گورکھ پرساد بذات خود اچھے شاعر تھےاور عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ان کا شمار شہر کے ممتاز وکلاء میں ہوا کرتا تھاان کا آبائی وطن بنوار پار تحصیل بانس گاؤں ضلع گورکھپور تھا۔بنوار پار بھی فراقؔ کے ایک بزرگ بنواری لال کے نام سے موسوم ہے۔فراقؔ کے مورث اعلی شیر شاہ کے زمانے میں کہیں سے آ کر یہیں آباد ہوئے۔جب سے یہ خاندان یہیں رہااور پھلا۔فراق کے بزرگوں نے جواس زمانے کے بڑے زمینداروں میں سے تھے پانچ گاؤں بسائے ۔اب بھی اس گاؤں کے رہنے والے''پنچ گاواں کے کائستھ'' کہلاتے ہیں۔

فراقؔ کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ان کے والد جناب عبرتؔ نے جوخود بھی اردواور فارسی کے عالم تھے،فراقؔ کواردواور فارسی کادرس دیا۔

فراق کے پھوپھی زاد بھائی راج کوکشور لال سحرؔ بھی ان اردو شاعری سے روشناس کراتے رہے۔ہندی کی تعلیم بھی انہوں نے اسکول میں داخلہ لینے سے قبل ہی حاصل کرلی تھی۔۹ سال کی عمر میں ان کا داخلہ ماڈل سکول گورکھپور میں ہوا۔مگر دوسرے ہی سال انھیں مشن سکول میں داخل کر دیا گیا جس کا شماراس وقت کے ابتدائی تعلیم کی بہترین درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعدان کا داخلہ جبلی سکول گورکھپور میں ہوا ۱۹۱۳ء میں انہوں نے یہیں سے سکول لیونگ سرٹی فکیٹ سکنڈ ڈوژن میں پاس کیا۔اور یف۔اے کرنے کے لئے میور سنٹرل کالج الہ آباد چلے گئے ۲۹ رجون ۱۹۱۴ءکوان کی شادی کشوری دیوی سے ہوئی جو بقول فراقؔ یہ شادی ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھی۔جس نے ان کی زندگی کوعذاب بنا دیا۔ان نا مساعد حالات کے باوجود انھوں نے ۱۹۱۵ء میں ایف۔اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرلیا۔لیکن اس کے بعد انھیں ایک سال کے لئے اپنی پڑھائی ترک کر دینی پڑی کیونکہ انھیں سنگرینی (نیند نہ آنے کا) مرض لاحق ہوگیا۔ ۱۹۱۸ء میں انہوں نے الہ بادیونیورسٹی سے بی۔اے۔کا امتحان پاس کیا۔اس امتحان میں فراقؔ کی پوزیشن پورے صوبے میں چوتھی تھی۔ذاکر

صاحب نے بھی اسی سال بی۔اے کا امتحان پاس کیا تھا اوران کی پوزیشن پورے صوبے میں تیسری تھی۔ ۱۷/ جون ۱۹۱۸ء کوا ن کے والد کا انتقال ہوگیا۔خاندان بھر کے لئے روٹیاں کمانے والا دنیا سے اٹھ چکا تھا۔کچھ دنوں بعد انگریزی سرکار کی طرف سے ڈپٹی کلکٹری کے لئے منتخب کرلیا گیا۔خاندان کی ڈوبتی ناؤ کے لئے یہ ایک بہت بڑا سہارا تھا۔لیکن ان کے دل میں ہائے ہائے مچی ہوئی تھی۔تیس ہزار روپئے کے خاندانی قرض کی ادائیگی کے لئے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کو جستہ جستہ فروخت کرنے کا انتظام کیا۔اور ذہنی اور دلی کرب اور ازدواجی زندگی کی بیزارگی کی وجہ سے I.C.S & P.C.S دونوں عہدوں سے استعفٰی دے کر گاندھی جی رہبری میں جنگ آزادی میں شریک ہوگئے۔اس دکھ بھرے زمانے میں دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لئے شاعری شروع کردی۔

پرنس آف ویلس ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کا دورہ کرنے آئے۔گاندھی جی قیادت میں اس دورے کا ملک بھر میں بائیکاٹ کردیا گیا،کانگریس کے تمام لیڈر گرفتار کرلئے گئے یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔یہ واقعہ ۶/دسمبر ۱۹۲۰ء کا ہے۔۱۳/دسمبر ۱۹۲۰ء کو جیل ہی میں ایک فرضی سی کاروائی کے بعد فیصلہ سنایا گیا۔آدھے لوگوں کو ڈیڑھ برس کی قید سخت اور سو روپئے جرمانے کی سزا ملی اور بقیہ آدھے لوگوں کو جس میں فراقؔ بھی شامل تھے قید محض اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا ملی۔فراقؔ اوران کے ساتھی ۱۴/دسمبر ۱۹۲۰ء کو تیسرے پہر آگرہ جیل پہنچ گئے۔تقریباً ایک برس کے بعد فراقؔ اوران کے ساتھیوں کو لکھنو جیل منتقل کردیا گیا۔لیکن دو ماہ ہندوستان بھر کے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔جیل سے چھوٹ کر جب وہ گھر لوٹ آئے تو گھر کی مالی حالت بہت نازک تھی۔اسی زمانے میں پنڈت جوہر لال نہرو گورکھ پور آئے۔وہ ان کے مہمان ہوئے انہوں نے انھیں اپنے دکھ درد کچھ نہیں بتائے۔لیکن سیاست عالم کے قیافہ شناس جواہر لال نے بے کچھ کہے سنے سب کچھ سمجھ لیا اور فوراً فراقؔ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے انڈر سکرٹری کی حیثیت سے الہ آباد کا دفتر کا کاروبار سنبھال لو۔جواہر لال کے کہنے پر فراقؔ گورکھپور چھوڑ کر الہ آباد چلے آئے اور ڈھائی سو روپئے مہینے پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مستقل سکرٹری بن گئے۔۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔۱۹۲۷ء میں جواہر لال نہرو دو سال کے لئے سیاست عالم کا مطالعہ کرنے یورپ چلے گئے۔پنڈت جی کے چلے جانے کے بعد فراقؔ کے لئے اس عہدے میں کوئی دلچسپی نہ رہی۔اسی لئے انہوں نے پہلے کرسچین کالج لکھنو اور بعد میں سناتن دھرم کالج کانپور میں بہ حیثیت انگریزی استاد کے کام کرنا منظور کرلیا۔۱۹۳۰ء میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں فرسٹ ڈویژن میں یم۔اے۔ حاصل کیا۔اور الہ باد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے،جہاں سے ۳۱/دسمبر ۱۹۵۸ء کو وہ سبکدوش

ہوئے۔ وظیفہ یابی کے بعد فراقؔ کو U.G.C. کا NATIONAL RESEARCH PROFESSOR مقرر کیا گیا۔ بحیثیت ریسرچ پروفیسر فراقؔ ۱۹۶۶ء تک کام کرتے رہے۔انھیں علمی خدمات کی بنیاد پر انہیں متعدد انعامات ملے جن میں ہندوستان کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''گنان پیٹھ ایوارڈ'' بھی شامل ہے۔ حکومت نے مختلف اعزازی عہدوں سے نوازا۔مگر آخر دم تک زبان وادب کی خدمت کو ہی سب سے بڑا اعزاز سمجھا۔اور آخر یہ عہد ساز شاعر ۳؍مارچ ۱۹۸۲ء کو دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو گیا۔

فراق کی شاعری:۔

فراقؔ نے جب شاعری شروع کی تو امیرؔ مینائی اور داغؔ کا بول بالا تھا، وہ بھی امیر مینائی سے متاثر ہوئے، مگر جب انہوں نے اردو شاعروں کو پڑھا تو ان کے طرز میں تبدیلی آئی اور ان کا ایک طرز بن گیا جو اپنے آپ میں خصوصیتیں اور جدّت رکھتی ہے۔فراقؔ جذباتی مزاج کے ہیں مگر اپنے خیالات میں مستحکم ہیں اس لئے وہ اپنے خیالات نئے طریقے سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی زندگی کی ناہمواریوں اور داخلی کشمکش کے جذبات مجتمع ہو جاتے ہیں ان کی آواز میں انکسار کے ساتھ زور اور دردمندی کے ساتھ انسانی زندگی پر بھروسہ بھی ملتا ہے۔فراقؔ ان ترقی پسند مصنفوں اور مفکروں میں شمار ہوتے ہیں جو زندگی کے سبھی سنجیدہ مسئلوں کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ابتداء میں ان کی زبان فارسی آمیز تھی مگر بعد میں وہ ہندی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرنے لگے۔فراقؔ نے بیشتر غزلیں کہی ہیں، لیکن نظموں اور رباعیوں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔نثر میں بھی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، مگر خاص طور سے انھیں غزلوں ہی کے باعث عظمت حاصل ہے، کیونکہ ان کے ذہن کی جودت طبع، جذبات کی نرم کسک اور بیان کی انفرادی قوت اپنے پورے عرفان جمال کے ساتھ مجسم ہو اٹھتی ہے۔ان کے کچھ شعری مجموعے یہ ہیں۔۱) **نغمۂ ساز** ۲) **غزلستان** ۳) **شعرستان** ۴) **شبنمستان** ۵) **روح کائنات** ۶) **گل نغمہ** ۷) **دھرتی کی کروٹ** ۸) **گل بانگ**۔آخری مجموعے میں تقریباً سبھی نمائندہ تخلیقیں شامل ہیں۔فراق کے مجموعوں میں سے کچھ ناگری خط میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ نمونتاً کچھ شعر:۔

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس　　دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

دل دکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے، مگر　　ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

کب اپنے ہوش میں شب غم کا ثبات ہے اے درد ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

غرض کہ کاٹ دئے زندگی کے دن اے دوست وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

تھرتھری سی ہے آسمانوں میں زور کتنا ہے ناتوانوں میں

رفتہ رفتہ عشق مانوس جہاں ہونے لگا خود کو تیرے عشق میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اس دور میں زندگی بشر کی بیمار کی رات ہوگئی ہے

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی امیدوار ہوں میں کل موت بھی نظر آئی

فراقؔ کے بارے میں نقادوں کی رائے:۔

''فراقؔ کو اس صدی کے موجودہ پچاس سال کے منفرد اور ممتاز غزل گویوں کی صف اول میں جگہ مل چکی ہے اور یہ امتیاز معمولی نہیں ہے۔ غزل کی آئندہ ساخت و پرداخت اور سمت و رفتار میں فراق کا بڑا اہم حصہ ہوگا۔'' (رشید احمد صدیقی)

''فراق اپنی درد بھری داستان کو نرم، دھیمی، شیریں آواز میں بیان کرتے ہیں۔ درد کی شدت میں بھی وہ اپنی آواز پر قابو رکھتے ہیں اور اسے بلند آہنگ نہیں ہونے دیتے'' (پروفیسر کلیم الدین احمد)

''فراق کی غزل گوئی میں اس معنی میں ان کے عاشقانہ تجربوں یا فکری میلانات کی ترجمان نہیں ہے جسے عرف عام میں واردات قلبیہ یا ''امور ذہنیہ'' کا اظہار کہا جائیگا۔ اس میں وہ ریاض نفس بھی شامل ہے جو علم اور وقوف کی دین ہے۔ اس طرح ان کی شاعری ایک ماورائے شخصیت عنصر کی حامل بن جاتی ہے۔'' (پروفیسر احتشام حسین)

''فراق کی شاعری میں ہندوستانی اور آفاقی کلچر اس طرح شیر و شکر ہوگئے ہیں اور ہندستان کا مزاج اور اس کی ارضیت کچھ اس طرح سما گئی ہیں کہ غزل کی دوشیزگی نکھر آئی ہے وہ انتہاؤں کا ایک سلسلہ بن گئی ہے اور اس کی سادگی اور پرکاری اور ہشیاری میں کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی''۔ (پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

تنقید:۔ نئی تنقید خاص طور سے مارکسی تنقید کا آغاز ہندوستان کی نئی سماجی اور معاشی بیداری کے ساتھ اس وقت ہوا جب ترقی پسند مصنفین نے اپنی انجمن کی تاسیس کی۔ یہ وہ وقت تھا جب عوام کے سیاسی شعور نے جمہوری اشتراکیت پر مبنی آزادی کا مطالبہ کیا۔ سجاد ظہیر، ڈاکٹر عبدالعلیم، فیضؔ، سبط حسن، سردار جعفری، ممتاز

حسین وغیرہ نے مارکسی فلسفے کی بنیاد پر ادب اور زندگی کے رشتے کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ تنقید کا یہ سائنسی نقطۂ نظر اتنا وسیع بن گیا کہ کچھ ایسے مصنف جو پہلے فلسفۂ جمالیات کی بنیاد پر تخلیق ادب کی باتیں کیا کرتے تھے، تنقید کے نام پر اپنے داخلی احساسات کو پیش کرتے تھے، اس نئی طرز تنقید کی طرف چلے آئے۔ ان میں فراقؔ گورکھپوری قابل ذکر ہیں۔

فراقؔ جس طرح شاعری میں رومانیت میں ڈوبی ہوئی غزلوں کا گھیرا توڑ کر زندگی کے نئے شعور کی طرف بڑھے، اسی طرح تنقید میں انہوں نے سماجی پس منظر کو اہمیت دینا شروع کیا۔ مگر یہ بات صاف طور سے دکھائی پڑتی ہے کہ وہ تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر کو مکمل طریقے سے اپنا نہ سکے۔ ان کا انداز فکر نیا ہوتے ہوئے بھی فلسفۂ جمالیات کے نیچے دبا رہا۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے 'اندازے اور حاشیئے' شائع ہو چکے ہیں اور دو کتابیں **اردو کی عشقیہ شاعری**، **اور اردو غزل گوئی** بھی چھپ چکی ہیں۔ ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی اور ادب میں ایک طرح کا جذباتی اور تعمیری رشتہ چاہتے ہیں۔ لیکن مارکس وادیوں کی طرح اس انسان کے معاشی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا عکس ثابت کرنے کوشش نہیں کرتے۔ دراصل ان کا رجحان تاثریت اور جمالیات کی طرف ہے جس کے لئے وہ سماجی پس منظر کو ضروری نہیں سمجھتے۔

قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر (ولادت ۱۹۲۷ء) اردو کی ممتاز اور منفرد قلم کار ہیں۔ آپ کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد حیدر بھی اپنے زمانے کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ قرۃ العین حیدر نے ۱۹۴۷ء میں انگریزی ادب میں یم۔اے کیا۔ اور مزید تعلیم کے لئے لندن چلی گئیں، جہاں وہ معروف اخبار ٹیلی گراف کے شعبۂ ادارت اور بی بی سی سے بھی وابستہ رہیں۔ وطن واپسی کے بعد وہ کئی سال بمبئی کے انگریزی رسالہ ''امپرنٹ'' اور ''السٹریٹڈ ویکلی'' سے متعلق رہیں۔ اس کے بعد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ میں وزیٹنگ پروفیسر کی ذمہ داریاں نبھائیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' سنہ ۱۹۴۷ میں شائع ہوا تھا جو جدید افسانہ کا نقطۂ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، آگ کا دریا، کار جہاں دراز ہے، آخر شب کے ہم سفر، گردش رنگ چمن، چائے کا باغ، سیتاہرن اور چاندنی بیگم ان کے ناول ہیں، جن میں ''آگ کا دریا'' کو اپنے وسیع ترین کینوس، بے مثال کردار نگاری، اچھوتی تکنیک، صحت مند نظریہ حیات اور دلکش طرز بیان کے لئے جدید کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ناولٹ اور تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا کینواس بے حد وسیع ہوتا ہے جس میں برصغیر کی تاریخ اور تہذیب کا پس منظر ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر سنہ ۱۹۴۷ تک خیالی رومانی قصے لکھتی رہیں۔ مگر آزادی کے بعد کی صورت حال سے متاثر ہو کر جب انہوں نے اپنا پہلا ناول 'میرے صنم خانے' لکھا تو ان کا نقطۂ نظر اور صناعی دونوں بدلے ہوئے نظر آئے۔ اسی وقت سے انہوں نے ناول اور افسانے میں بے مثال ترقی کی ہے۔ انھوں نے مغربی ادب، ہندوستانی فن ثقافت کا گہرا مطالعہ کیا اور زبان کے استعمال پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ ان کی مقبولیت کا راز بھی ہندوستان کے زندگی کے دھاروں کی تلاش ہی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، اور پت جھڑ کی آواز ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں تخلیقی استعداد کی ایک خصوصیت نظر آتی ہے۔ انھوں نے کئی اچھے ترجمے کئے ہیں۔ اردو گنیان پیٹھ یافتہ

علی سردار جعفری

(ولادت۔ ۲۹/نومبر ۱۹۱۳ء۔ وفات۔یکم/اگست ۲۰۰۰ء)

سوانحی خاکہ:۔ علی سردار جعفری کی پیدائش بلرام پور ضلع گونڈا، اتر پردیش میں ہوئی۔ موجودہ دور کی کثیر الجہات شخصیت، ذی فہم ادیب، صاحب نظر نقاد، بالغ نظر مفکر، انسان دوست، امن کا شیدائی، اشتراکیت کا علم بردار، صحافت وخطابت کا مرد میداں اور میڈیا کا جانکار، شعلہ نوا حد درجہ اہم انقلابی شاعر تھے۔علی سردار جعفری کی شاعری کے کس بل کی نشان دہی بچپن ہی سے ہو رہی تھی۔ دو سال کی عمر میں اپنی توتلی زبان میں تک بندی کرنے لگے تھے۔ بچپن ہی سے حدیث خوانی اور اہل بیت کی شان میں قصیدہ سرائی شروع کر دی تھی کسی نے بچپن میں ایک بار ان کا نام پوچھا تو انہوں نے جواب دیا

نور نظر احمد مختار ہوں میں　　لخت جگر حیدر کرار ہوں میں
ہے فتح وظفر قوت بازو سردار　　یعنی پسر جعفر طیار ہوں میں

۱) احمد مختار چھوٹے چچا کا نام ۲) حیدر کرار منجھلے چچا کا نام ۳) ظفر عباس بھائی کا نام ۴) جعفر طیار والد کا نام۔
(ڈاکٹر شمیم رضوی 'قطرے سے گہر ہونے تک' ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۲۸)

علی سردار جعفری کا گھریلو ماحول مذہبی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ احمدیہ میں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی فراغت کے بعد بڑے ہی موثر انداز میں تقریر اور نوحہ خوانی کرنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے والدین انھیں مولوی بنانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے روایتی قسم کے نام نہاد مولوی بننے سے احتراز کیا۔ وہ سلطان المدارس لکھنو سے تین بار بھاگے اور مغرب کی جدید تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ ملک کے نامور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ باغیانہ ذہن کی وجہ سے ان کی تعلیم اور مشق سخن کی رغبت نے انہیں علم وادب کے میدان میں ممتاز مقام عطا کیا۔ انھوں نے مطالعے کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا۔ ان کی زندگی کے ماحصل کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ بظاہر انھوں نے مولوی بننے سے گریز کیا تھا مگر صحیح معنوں میں وہ زندگی بھر مولوی رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے مدرسہ موضوع کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ ان کی نگاہ میں پوری دنیا مدرسہ ثابت ہوئی

۔اصلاح معاشرہ، اخوت ومحبت اور احترام آدم ان کا نصب العین تھا۔ان کے نزدیک ظلم بدعت تھی۔انھوں نے حسین ابن علی کی قربانی اور ایثار کو اپنا شعار بنایا تھا۔۔کہیں منشائے والدین مشیت ایزدی تو نہیں ہوا کرتی۔(ڈاکٹر غلام حسین۔لکھنو کی پانچ راتیں۔ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۴)

مجاہد آزادی:۔۱۹۳۶ء میں علی گڈھ کی تعلیم کے دوران برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں تقریر کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دئے گئے۔یہ گویا ان کا پہلا احتجاجی قدم تھا۔''تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے جعفری صاحب کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا اور پھر اسی یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔لٹ کی ڈگری سے نوازا۔دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور یم۔اے کے لئے لکھنو یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔لیکن یہاں بھی تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ انھیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔(سردار جعفری کچھ یادیں۔کچھ باتیں پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۲)۱۹۴۰ء میں لکھنو یونیورسٹی کے دوران تعلیم باغیانہ جراءت مندی پر پہلی بار جیل ہوئی اور پھر لکھنو ڈسٹرکٹ جیل، بنارس سنٹرل جیل، آرتھر روڈ جیل بمبئی، ناسک سنٹرل جیل کی زندگانی کے لمحات نے ان کی متاع لوح قلم کو جلا بخشی۔ (ڈاکٹر شمیم رضوی 'قطرے سے گہر ہونے تک' ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۲۸)

انھوں نے مارکسی نصب العین کو اپنا لیا تھا، اور تخلیقی ادب میں اسی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اظہار کے تین وسیلے ہیں، اول:۔طبقاتی کش مکش کے طور پر مزدور اور محنت کش طبقے کا ذکر دوم:۔نظام کہنہ کے خاتمے کے لئے انقلاب اور بغاوت کا ذکر سوم:۔عورت کے بجائے عروس وطن سے التفات اور اس کا خصوصی ذکر۔ (ڈاکٹر شمیم رضوی 'قطرے سے گہر ہونے تک' ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۲۸)

سردار جعفری کی شاعری:۔شروع میں انھوں نے کچھ رومانی نظمیں لکھیں۔لیکن اب ان کا شعور سماجی اور سیاسی مسئلوں کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ان کے اس شعور کا ارتقا قومی اور بین الاقوامی شعور کے ساتھ رہا اور اس کا ایک اچھا آئینہ بھی ہے۔انسان دوستی ان کی شاعری میں پھٹی پڑتی ہے۔ناانصافی اور ظلم کے خلاف جعفری کے لفظ اور جملے ''آتش فشاں'' کے مانند پھٹے پڑتے ہیں۔ان کا طبقاتی شعور ان کی نظموں میں سچا زور بھر دیتا ہے۔

سردار جعفری نے اپنی زندگی میں جو ادبی سفر کیا اور اس کی یادگاریں چھوڑیں وہ اس طرح ہیں۔''پرواز''

(شاعری کا پہلا مجموعہ)۱۹۴۳،''کس کا خون ہے''(شعری مجموعہ)''نئی دنیا کو سلام''(طویل تمثیلی نظم)۱۹۴۸، جو شہنشاہیت مخالف جذبات سے معمور ہے اور آزاد وزن کے استعمال کا ایک بہت عمدہ نمونہ مانی جاتی ہے۔نظم کا یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا بھارت کی تقریباً گیارہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔''خون کی لکیر''(نظمیں)۱۹۴۹،'' امن کا ستارہ''(طویل نظم)۱۹۵۰، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، جیل میں لکھی گئی تھی اس کی زبان آسان اور بحر چھوٹی ہے۔نظم اپنے دور کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کی روحانی گھٹن، تنہائی اور ویرانی کا اظہار کرتی ہے۔اس میں جعفری نے کامیاب داخلی مصوری بھی کی ہے۔شاعر آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی نئے انقلاب کے خوابوں میں الجھا رہتا ہے۔فنی اعتبار سے بھی نظم کامیاب ہے۔

پتیوں کی پلکوں پر　　اوس جگ مگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر　　دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے　　مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے میں　　چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں　　پھر بھی ایک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر　　دودھ جذب ہو جائے

'شادی کا دن' اور 'جیل کی رات' سردار جعفری کی دو مختصر نظمیں ہیں جو فنی اعتبار سے بھی مکمل اور موثر ہیں۔ ان میں ایک سے ایک اچھوتی اور تشبیہات اور استعارات استعمال ہوئی ہیں۔آزاد نظم کے فارم میں لکھی گئی ہیں اور جیل کے اندر لکھی گئی ہیں۔جیل کی ایک رات کا بند اس طرح ہے۔

پہاڑ سی رات
اداس تارے تھکے مسافر
گھنا اندھیرا سیاہ جنگل
جہاں سلاخیں اگی ہوئی ہیں
اذیتوں کے پرانے عفریت قیدیوں کو نگل
------رہے ہیں
خموشی سہمی ہوئی کھڑی ہے

ے علی سردار جعفری اور عوامی ادب (ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۰)

''**ایک خواب اور**'' یہ شعری مجموعہ بھی ہے اور ایک نظم کا عنوان بھی۔ یہ آزادی ملنے کے بعد لکھی گئی۔ جو کتنے حسین خوابوں کی بھیانک تعبیر تھی۔ وطن کے حصے بکھر گئے اور ملک میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ اور رنگ اور گلال کے بجائے انسانی خون سے ہولی کھلی گئی جس کے خلاف فیضؔ، مخدومؔ، جوشؔ بہت سے شعراء نے ردعمل ظاہر کیا ہے۔ ۔سردار جعفری نے بھی ردعمل ظاہر کیا اور آخر میں دعوت دی ایک اور خواب دیکھنے کی۔

پھینک پھر جذبۂ بےتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اس ہمت دشوار پسند

سردار کی یہ نظم تشبیہات اور استعارات سے مملو ہے۔

ان کی آزاد نظم کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے۔

جاگ ہندوستان اپنے خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آ رہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانے کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے
یہ ہمالہ ہے، یہ وندھیاچل ہے، یہ نیل گری
یہ تیرے کھیت ہیں تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ، باغ ہیں تیرے کارخانے

ہاتھوں کا ترانہ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیّوں کی روانی ان سے ہے
تہذیب کی اور تمدّن کی بھرپور جوانی ان سے ہے
دنیا کا فسانہ ان سے ہے، انساں کی کہانی ان سے ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
صدیوں سے گذر کر آئے ہیں، یہ نیک و بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود شکتی کے اوتار ہیں، یہ کب غیر کی شکتی مانتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب، تحریریں اور تقریریں

یہ تیرے سبز و شاداب میدا ں، یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی، انسانوں کی تقدیریں
یہ تیری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیا ں سب حکمت و دانش علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیا ں ہیں ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان کو اپنے گلے سے لگا لے یہ سرحد سرحد جڑتے ہیں اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں
اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور دل سے دل کو ملاتے ہیں
پھر ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیریں بن جاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
تعمیر تو ان کی فطرت ہے، اک اور نئی تعمیر سہی
اک اور نئی تدبیر سہی، اک اور نئی تقدیر سہی
اک شوخ و حسیں خواب اور شوخ و حسین تعبیر سہی
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کو چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

سردار جعفری اپنے دھن کے پکے تھے۔ شاعری کی دنیا میں اپنا لوہا منوا کر رہے۔ انھوں نے زندگی کا رخ بدلا لیکن حالات سے منہ کبھی نہ موڑا۔ بقول جعفری ''میں نے صرف پھولوں اور ستاروں محبوب کے رخساروں اور آنکھوں، چھلکتے ہوئے جاموں اور لرزتے ہوئے پیراہنوں میں حسن نہیں دیکھا ہے بلکہ تیل کے چشموں اور کوئلے کے کانوں اور سوت کے کارخانوں میں بھی حسن کو بکھرا ہوا دیکھا ہے''۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جعفری کے گھر سے جدید شاعری نے جنم لیا وہ جدید شاعری کے پیکر ہیں۔ نئے نئے الفاظ، نئے نئے تشبیہات اور استعارات اس طریقہ سے اپنی شاعری میں استعمال کئے ہیں کہ نا قابل فراموش ہیں۔ کوئلہ کو سیاہ ہیرا، چشموں کے تیل کو پگھلتے ہوئے ستارے، روئی کو کپاس کی چاندنی وغیرہ۔ ایسی نئی تصویریں پیش کئے ہیں۔ ادب اور فن کے لئے اگر کوئی قیمتی چیز دنیا میں ہے تو وہ بقول جعفری ''میرے لئے زمین سے زیادہ حسین، انسان سے زیادہ پُر وقار اور مستقبل سے زیادہ تابناک کوئی چیز نہیں ہے''۔ بے شک یہ تین چیزیں دنیا میں اپنا اپنا مقام رکھتی ہیں۔

ایک مرتبہ اعظم گڈھ میں شبلی اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا تھا جس میں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی شریک تھے اس جلسے میں سردار نے اپنی نظم ''سرحد پڑھی تھی۔ جو بہت پسند کی گئی۔ خاص کر اس کا آخری بند جس میں انہوں نے سرحد کو مانگ سے تعبیر کیا ہے کافی پسند کی گئی۔ (ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۰)

ان کے علاوہ شاعری کا ایک مجموعہ 'سرحد' بھی ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی جب فروری ۱۹۹۹ء میں بس سے لاہور (پاکستان) گئے تھے تو اپنے ساتھ یہ مجموعہ لے گئے تھے۔

انسانیت کی بنیاد پر ہندو پاک دوستی کو فروغ دینے میں سردار جعفری کی شاعری نے اہم رول ادا کیا اور ان کے یہ سب سے بڑا اعزاز تھا کہ دو ملکوں کی سرحد پر جب دونوں ملکوں کے وزیر اعظم امن دوستی اور بھائی چارے کی بات چیت کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے تو سردار کی نظموں نے ان کے درمیان کڑی کا رول ادا کیا اور ان کی نظموں کا مجموعہ ''سرحد'' غیر معمولی شہرت کا حامل ہوا۔ ان کی نظم 'سرحد' اور 'گفگو بند نہ ہو' کا بول بالا رہا۔ یہ سردار جعفری کا ان کی زندگی میں سب سے بڑا اعزاز تھا۔ یہ اعزاز ان کے لئے دلی تسکین کا باعث بنا۔ (اردو کا بے باک شاعر علی سردار جعفری ڈاکٹر سید معصوم رضا ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۳)

پوری نظم سرحد پر ہونے والے حادثات اور سانحات کے گرد گردش کرتی ہے اور سردار اس کے محافظ نظر آتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہندو پاک کی ہولناک جنگ کے موقع پر لکھی گئی یہ نظم بڑی معنوی تہ داریت اور تخلیقیت رکھتی ہے گویا ہندوستانی تاریخ اور سرحد کے حوالے سے کشت وخون نفرت وحقارت اور انسانیت سوز جنگ وجدال کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم ماضی کی کوتاہیوں، موجودہ صورت حال اور کشمکش مستقبل کے لائحہ عمل کی سچی تصویر دیکھ سکتے ہیں جو عبرت ناک بھی ہے اور ناقابل فراموش بھی۔

اس سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں
یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے جھلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

ان اشعار کی روشنی میں شاعر بظاہر سرحد سے منتظر نظر آتا ہے لیکن دیکھا جائے تو مخصوص اوقات اور تناظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ نظم سرحد کے وجود کے تعلق سے اس ہولناک اور خونریز حادثات کی یاد تازہ کر کے انتباہ بھی کرتا ہے اور اس کے وجود کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی سعی بھی۔ خون، آہوں اور کراہوں کے درمیان اس کا جنم ہوا اور کشت وخون کے بعد ہی اس کی حد بندی ممکن ہوسکی۔ شاعر سرحد کے اس تاریخی واقعات اور سانحات کو اس لئے بھی یاد کرتا ہے کہ یہ انسانیت کا خون، نفرت کے شعلے اور اجڑے خاندانوں کی علامت ہے، یادگار رہے اور تاریخ کا اہم باب بھی۔ (سرحد کا محافظ علی سردار جعفری ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۸)

سردار جعفری نے اپنے قلم سے سرحد کی خلیج کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ہندو پاک تنازعہ سے انھیں بڑی تکلیف تھی۔ وہ دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس خواہش کو اکثر انھوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔ **'نظم کون دشمن ہے'** کا ایک بند

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں گے صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

نظم **'گفتگو'** کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ نظم کا یہ بند خاص طور پر قابل توجہ ہے:

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح سے شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے

(علی سردار جعفری مرحوم انور الحسن وسطوی۔ ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۵)

عہد حاضر میں سرحد سے مراد محض حدود ملک نہیں بلکہ افواج کی کسرت، جنگی مشقیں اور توپ اور شعلہ و بارود ہے جو انسانی وجود کو کسی لمحہ تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے۔ سرحد پر ہونے والی ہلچل، توپ وتفنگ کا جماؤ، انسانی جسم کے بے ترتیب ٹکڑے اور خون میں لت پت بے گناہ انسان کی لاشوں کی منظر کشی کسی خاص ملک اور خطے تک محدود نہیں بلکہ خطۂ ارض کے تمام ملکوں کی سرحدوں کی تصویر ہے۔ (ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۸)

ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، مترجم:۔ ''ترقی پسند ادب'' (نثر)، ۱۹۵۳ء، ''لکھنو کی پانچ راتیں'' (نثر) ۱۹۶۲ء، ''منزل'' (افسانوں کا مجموعہ)، ''پیار'' (ڈرامہ) جعفری نے میرابائی اور کبیر داس کے کلام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ رام داس اور کالی داس کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ '' پیغمبران سخن'' (کبیر، میر، غالب) ۱۹۷۰ء، ''اقبال شناسی'' (نثر) ۱۹۷۷ء، ''لہو پکارتا ہے'' (نظمیں) ۱۹۷۸ء، انگریزی زبان میں قرۃ العین حیدر کے ساتھ Ghalib and his poetry ترقی پسند ادب کی نصف صدی، نظام اردو خطبات (ہماری زبان ۱۵/اگست ۲۰۰۰ء ص ۱)۔ نثر میں ایک کتاب اور ہے جس میں اردو شاعری میں استعمال ہوئے الفاظ (استعارہ اور تشبیہ وغیرہ کے طور پر) کو مع مثال اور وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیوان غالبؔ، دیوان میرؔ، اور کبیرؔ کی تالیف و ترتیب بھی کی ہے جو ہندی اردو رسم الخط میں ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں

بے مثال مقرر:۔ بمبئی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی تاسیس سے اب تک وہ اس شعبہ سے بے پناہ دلچسپی رکھتے تھے۔ سردار جعفری اور مجروح دونوں زندگی کے آخری ایام تک بڑی پابندی سے اس کی میٹنگوں، سیمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کرتے۔ جعفری صاحب بہترین مقرر تھے، وہ سیمیناروں میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے، ان کا طرز ادا، ان کا ڈکشن، ان کی لفظیات، ان کا حافظہ کوئی کہاں سے لائے گا وہ بولتے تو جی چاہتا کہ تقریر کبھی ختم نہ ہو ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

ان کو دیکھنے اور سننے کے بعد یہ خیال کہ ع

کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

(ہماری زبان علی سردار جعفری نمبر ص ۱۲)

ڈاکٹر خلیق انجم نے انھیں دور حاضر کا ادبی مقرر قرار دیا ہے۔

(ہماری زبان ۸/اگست ۲۰۰۰، ص ۵)

صحافی:۔ انھوں نے مجاز، سبط حسن کے تعاون سے ایک رسالہ ''نیا ادب'' نکالا تھا بعد میں وہ بمبئی چلے گئے جہاں فلمی اور ادبی کاموں میں لگے رہے۔ سردار جعفری ایک اعلیٰ پایہ کے صحافی بھی تھے ان کی وابستگی 'نیا زمانہ، نئے ادب اور دوسرے ترقی پسند رسالوں سے تھی۔ وہ ایک رسالہ ''گفتگو'' سہ ماہی کا فی ضخیم نکالتے تھے۔ وہ بڑی سائز میں ایک ادبی مجلّہ ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے اس کے کئی نمبر بھی نکالے۔ ایک ترقی پسند نمبر بھی نکالا تھا جو اگست ۱۹۸۰ میں

شائع ہوا تھا جس سے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو ناول ۱۹۳۶ء کے بعد'' کی تیاری میں مشغول تھے جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔(سردار جعفری اور عوامی ادب۔ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۲۶)

فلمی دنیا سے وابستگی:۔سردار جعفری فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔انکے قول کے مطابق وہ سرحد پر ٹہلتے رہتے تھے جہاں سے انھیں کوئی فلم والا کھینچ لے جاتا تھا تو وہ اس کے لئے کام کر دیا کرتے تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے کئی فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں ہیں اور کئی فلموں کی ہدایت بھی کی ہے۔انہونی، منا، دھرتی کے لال، آسمان، محل، شہر اور سپنا، نکسلائٹ جیسے فلموں کے نغمے لکھے ''شام غم کی قسم'' صدا بہار گیت ہے جو آج بھی ہر انسان کی زبان پر ہے۔اور کئی بعض فلمیں بھی بنائیں جن میں سے ''گیارہ ہزار لڑکیاں'' تعلیم یافتہ حلقہ میں کافی پسند کی گئی۔اس میں ترقی پسند نقطۂ نظر سے دور اس دور کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے مسائل پیش کئے گئے تھے۔ایک زمانے میں اردو کے مشہور ادباء و شعراء (سرسید، جگر مرادآبادی، وغیرہ) کی زندگی پر ٹی۔وی فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ویسے وہ ایسے ہی عوامی، ادبی اور مقصدی فلمیں بنایا کرتے تھے۔وہ اس طرح اردو شعراء و ادباء سے عوام کو روشناس کرانا چاہتے تھے جو کتابوں میں ان کو نہیں پڑھ سکتے تھے۔

علی سردار جعفری کو اللہ تعالٰی نے انعامات و اکرامات و اعزازات سے نوازا۔اردو سے متعلق کمیٹیوں کے اکثر صدر نشین اور کبھی رکن رکین رہے۔مثلاً بھارت سرکار نے انہیں ۱۹۹۸ گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا۔سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، پدم شری کا خطاب، سجاد ظہیر ایوارڈ، فیض احمد فیض، اقبال سمان۔اقبال مڈل (پاکستان) مخدوم ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ اور غالب ایوارڈ وغیرہ۔حکومت بہار نے بھی ۱۹۹۷ء میں جعفری کو مولانا الحق سے نوازا تھا، جو ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے، شال اور توصیفی سند پر مشتمل تھا۔(ہماری زبان سردار جعفری نمبر ص ۱۵) علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی مجموعی خدمات پر ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔واجپائی ساحب نے گیان پیٹھ ایوارڈ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''علی سردار جعفری کو یہ اعزاز دے کر ہم نے اپنی عزت افزائی کی ہے۔وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ان کی شاعری کا نہایت باریک بینی سے جائزہ بھی لیا تھا، اس کی بڑی تعریف بھی کی ہے۔''وہ جدوجہد کے شاعر ہیں۔امن کے شاعر ہیں۔اگرچہ کبھی کبھی جنگ کی تلقین بھی کرتے ہیں، لیکن جنگ امن کے لئے، ظلم کے خاتمے کے لئے، سامراجیت سے لڑنے کے لئے۔انہوں نے اس رجحان کا پتا دیا تھا۔(ماہنامہ نیا دور جولائی ۱۹۹۹ء) ۱۹۴۲ میں ممبئی کیا آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶ برس کی تھی۔کافی دنوں

سے ممبئی اسپتال میں برین کینسر کا علاج جاری رہا آخر کار یکم اگست ۲۰۰۰ کو خالق باری سے جا ملے۔

علی سردار جعفری نے اپنی ساری زندگی اردو زبان وادب کے گیسوؤں کو سنوارنے میں گزار دی انھوں نے اردو ادب کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا اور جو کچھ ان کے دل و دماغ میں انسان کی فلاح و بہبود کے جو منصوبے تھے وہ آخری دم تک اس کے لیے فکر مند رہے۔ ہندو مسلم اتحاد، انسانی مساوات اور اردو کی ترویج و بقا کے لئے انھوں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ اب جا کر انہیں چین ملا۔ ان کی موت پر بلا لحاظ مذہب وملت سبھوں نے خراج عقیدت پیش کر کے ان کی ادبی عظمت کو مسلم اور مستند قرار دیا۔ ہندوستان گیر پیمانے پر جن دانشوروں نے خراج عقیدت پیش کیا ان کی شاعری اور ان کی دانشورانہ عظمت کے لئے کافی ہے۔

اردو گنیان پیٹھ یافتہ